پانچ مقبول شاعر
اور ان کی شاعری
فراق
ساحر
سردار جعفری
قتیل
شکیل
مرتبہ
نریش کمار شاد

اُردو ادب کے پانچ مقبول شاعر

فراقؔ گورکھپوری ۔ سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی قتیلؔ شفائی اور شکیلؔ بدایونی ـــــ جنہوں نے اپنے اپنے طور پر اُردو شاعری کو اپنے کلام سے جلا بخشی۔

اب

ایک سانجھ سٹار پاکٹ بک سیریز کی اِس

دوسوویں

کتاب میں جلوہ افروز ہیں اور اِن پانچوں شعراء حضرات کو ایک تار میں پرونے والے ہیں

نرلیش کمار شادؔ

سٹار
پاکٹ
بک
سیریز
کی
۲۰۰ ویں
پیشکش

پانچ
مقبول
شاعر
اور
انکی
شاعری
فراق
ساحر
سردار جعفری
قتیل
شکیل
مرتبہ:
نریش کمار شاد

ناشر

سٹار پبلیکشنز
دریا گنج دہلی ۶

قیمت ایک روپیہ صرف

سول ایجنٹس

پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں۔ دہلی ۶

طابع

پربھات آفسٹ پریس دہلی ۶

KASHMIR RESEARCH INSTITUTE
R. No.

فراق گورکھپوری

فراق گورکھپوری کی بھرپور علمیت اور مشاہدۂ حیات کی غیر
معمولی وسعت نے اُردو غزل کو نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے
اور انتہائی ذہانت کیساتھ اُنہوں نے اُسے زندگی کے جدید مسائل
سے ہم آہنگ کیا ہے اور اُن کی حسین و جمیل رباعیاں اُنکے
احساسِ جمال کی لطافت اور طہارت کی ایسی دلکش مورتیاں
ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کے مندر میں عظیم الشان
اور ناقابلِ فراموش اضافہ کیا ہے۔ بلاشبہ فراقؔ کے
نغمے سدابہار اور سداسہاگ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں
صدیوں تک اِن نغموں کے آبِ حیات سے اپنی پیاس
بجھاتی رہیں گی۔

فراق صاحب اُس شام بُجھے بُجھے سے بیٹھے تھے۔ میں نے آداب بجا لانے کے بعد جب صحت کے متعلق دریافت کیا تو اور بھی بُجھ گئے اور بڑی بے دلی سے کہنے لگے "اب صحت کیا ٹھیک ہوگی۔ گرتی ہوئی دیوار ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں ہر وقت درد رہتا ہے اور یہ درد بعض اوقات تو ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔" اس کے بعد وہ درد سے کراہنے لگے ـــــ پھر کچھ رسمی سی بات چیت ہوئی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آج اِس گل افشانیٔ گفتار کے پیکر کا جلال میں آنا محال ہے۔ بہر حال میں نے اِس محال کو ممکن بنانے کیلئے خواہ مخواہ جوشؔ ملیح آبادی کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جوشؔ صاحب کے متعلق پاکستان کے کسی جریدے میں آپ نے لکھا ہے کہ جوشؔ نے بہت سے ناخوشگوار اثرات مجھ پر پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ اثرات ہیں کیا؟"

فراقؔ صاحب نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"جوشؔ میرے جگری دوست ہیں۔ میں اُنھیں شاعرِ اعظم مانتا ہوں۔ وہ ہفتوں بلکہ مہینوں میرے گھر میں گھر کا ایک فرد بن کر رہ چکے ہیں۔ میں اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں لیکن اُن کی شخصیت کے ڈیڑھ دو فیصدی ناخوشگوار اثرات بھی مجھ پر ہیں۔ انہوں نے ایک خیالی خواب دیکھ کر ہندوستان کو چھوڑا جس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں بہت غم پیدا ہوا۔ میرا ماتھا اگرچہ اُس وقت بھی ٹھنکا تھا۔ لیکن اُن سے قدرے ناآسودگی

اور بیزاری کے میرے جذبے کا اُن کے وہاں چلے جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں تو کئی سال پہلے میری اُن سے اَن بن ہو گئی تھی۔ بعد میں اپنی رباعیات کے مجموعے "روپ" کا اُن کے نام انتساب کرتے ہوئے میں نے اِس ان بن کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ اعتراف ہے کہ جوشؔ صاحب کا دل بھی میرے دل کی طرح صاف ہے۔ وہ میرے لئے بدی کا لفظ کبھی نہیں بولے اور نہایت خلوص سے میری شاعری کے معتقد ہیں۔"

فراقؔ صاحب جذبات کی رَو میں بہے جا رہے تھے میں نے اُنہیں چونکاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو سب ٹھیک ہے حضرت! لیکن میں تو اُن ناخوشگوار اثرات کی بات کر رہا تھا۔"

"ہاں۔ ناخوشگوار اثرات ــــ!" فراقؔ صاحب واقعی چونکتے ہوئے بولے۔ "ارے کچھ ایسے ناخوشگوار بھی نہیں میرے یہ ڈیڑھ دو لفظ جنہیں آپ مہمل بھی کہہ سکتے ہیں محض اِس احساس کی پیداوار ہیں کہ جوشؔ صاحب صرف مخدوم ہو کر رہ گئے ہیں، وہ خراجِ عقیدت لیتے تو ہیں مگر دیتے نہیں۔ یوں تو میرے اپنے کردار میں بھی بہت سی خرابیاں ہیں۔ جنسی زندگی جو ایک انسان کی پرائیویٹ ملکیت ہوتی ہے، میرے یہاں کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ لیکن جوشؔ صاحب کی ناآسودہ کرنے والی باتیں۔!" اور اُس کے بعد مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "اب جوشؔ صاحب کو اگر آپ۔ پونا سے کب آئے" میں "پونے سے کب" کی بجائے "پونہ سے کب" بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گھوڑا کی دُم" کہے تو جوشؔ صاحب کی ایسی باتوں پر غصہ نہیں پیار آنا چاہئے۔

یہ تو اُن کے حسین نخرے ہیں۔"

میں نے فراقؔ صاحب کی توجہ پھر اصل سوال کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔ "ان ناخوشگوار اثرات کی وضاحت کیجئے۔"

فراقؔ صاحب کے چہرے پر ہلکی سی برہمی کی پرچھائیں پڑی اور اُنہوں نے کہا۔ "مثلاً بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جوشؔ، نہروؔ، آزادؔ اور شنکر لال سے اپنے اثرات سے کچھ کام کرا لیتے تھے، اِس میں اُنکا رویّہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کا فائدہ کراتے کراتے اپنا بھی فائدہ کر لیتے تھے۔"

"تو اِس میں کسی کا کیا نقصان ہوتا ہے؟"

"جی ہاں!" فراقؔ صاحب نے میری تائید کی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ذرا جھنجھلا کر بولے۔ "جوشؔ سے میری نا آسودگی، محبت کی نا آسودگی ہے۔ جوشؔ صاحب کی عظمت کو دیکھتے ہوئے اُنکے بارے میں ایسی باتیں سننا بھی اچھا نہیں لگتا۔ ایک بات اور کہہ دوں۔ کہ میں پروفیسر آدمی ہوں۔ معاملے کا آدمی نہیں، اِس لئے ایسے معاملات میں اپنی رائے پر اعتماد بھی نہیں کرتا۔" اور پھر بہت ہمدردانہ لہجہ میں کہنے لگے۔ "جوشؔ کے ساتھ کچھ مجبوریاں بھی ہیں، بے چارے کا بیٹا لائق نہیں ہوا۔ داماد بھی، جب تک یہاں تھے تو اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم پانے کے باوجود کچھ نہیں کرتے تھے۔ جوشؔ پر متعلقین کا بوجھ بہت زیادہ ہے ایسے عالم میں ہماری تو کمر خم ہو جاتی جناب!"

"جناب" کا لفظ فراقؔ صاحب نے اپنے خاص انداز میں لمبا کر کے ادا کیا؛

میں ناخوشگوار اثرات کے سلسلے میں تو فراق کے جواب سے مطمئن نہ ہو سکا لیکن یہ امر میرے لئے تسلی بخش تھا کہ جوش صاحب کے ذکرِ خیر نے فراق کی رگِ تکلم کو چھیڑ دیا ہے۔

فراق صاحب! پچھلے دنوں جب جوش صاحب یہاں تشریف لائے تھے تو ـــــ" میں نے ارادتاً جوش صاحب کے ذکر کو طول دیتے ہوئے کہا۔" میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ اردو کے جدید ترین شاعروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ تو اِس کے جواب میں اُنھوں نے کہا تھا کہ میری رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ بھی اِن شاعروں کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں؟"

"نہیں بھائی! میں ایک ڈنڈے سے سب کو نہیں ہانکوں گا"
فراق صاحب کی طبعی شگفتگی عود کر آئی ـــــ "میں محسوس کرتا ہوں کہ یورپ کے ادیبوں میں مطالعے کی روایات ہم سے زیادہ مضبوط ہیں۔ آج کل کے اُردو شاعروں کو خالص اُردو کتابوں کا مطالعہ اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتا جتنا انگریزی کتابوں کا۔ لیکن ہمارے ہاں سماجی اور اقتصادی حالات کچھ ایسے ناہموار ہیں کہ ہمارا نیا شاعر ذاتی طباعی کو مطالعے سے زرخیز نہیں بنا سکتا اور پھر یہ زمانہ انتشار کا زمانہ ہے۔ جو شاعری کے لئے زیادہ سازگار نہیں۔ آج شاعری پوری دُنیا میں ایک بحرانی دور سے گذر رہی ہے۔ ہمارے وہ شاعر جن کی عمر پچاس سال سے کم اور تیس سال سے زیادہ ہے، اُن میں سے بعض کی شاعری اچھی خاصی تو ہے لیکن پُرعظمت نہیں۔ جدید شاعری میں کچھ حسین آوازیں تو بے شک سُنائی دیتی ہیں لیکن کوئی بڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ لیکن نئے

شاعروں کی طرف سے جو تجربے کئے جا رہے ہیں وہ سب کے سب
ایسے نہیں ہیں جنہیں لغو قرار دے دیا جائے۔"

"ہم جدید شاعروں کے کماں دار فیض احمد فیض کے
بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

فراق صاحب کچھ سوچتے ہوئے رُک رُک کر بولے۔

"دستِ صبا میں اور اُس کے بعد سے فیض نہ جانے کیوں زبان کی صحت
سے بے پروا ہو گئے ہیں۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔
لیکن اُن کے کلام کی اشاریت میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کی ناسازی کے باوجود فراق
صاحب اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر باتیں کرنے کے موڈ میں آ گئے ہیں۔

"فراق صاحب! کیوں نہ اِس پُر لطف گفتگو کو باقاعدہ انٹرویو
کی شکل دیدی جائے۔" اور اُن کے جواب کے انتظار کئے بغیر میں نے
سوال کر دیا ــــ "آپ عالمِ وجود میں کب آئے قبلہ!"

"۲۸ اگست ۱۸۹۶ء بروز جمعہ، بوقت دوپہر۔"

"خوب ــــ! اور شاعری کا آغاز کب ہوا؟"

"والدِ محترم حضرت عبرت بھی شاعر تھے۔ بچپن میں اُن سے
شعر سُن کر متاثر ہوتا تھا۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ڈرتے ڈرتے خود بھی
کچھ شعر موزوں کئے۔"

"اپنے ابتدائی کلام پر اصلاح کس سے لی؟"

والد کو کچھ اشعار ضرور دکھائے۔ لیکن اُن کے انتقال کے
بعد کسی سے اصلاح نہیں لی، ویسے میرے چند مصرعوں میں پروفیسر

مہدی حسن ناصری۔ اور امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیرآبادی نے بھی ترمیم کی، ریاض خیرآبادی نے بھی دو ایک مصرعے دیکھے تھے لیکن حقیقت میں میرا مطالعہ ہی میرا اُستاد ثابت ہوا۔"

"کس کس شاعر سے آپ غیر معمولی طور پر متاثر ہیں؟"

"۲۴-۱۹۲۳ء میں آمیر مینائی کی شگفتہ بیانی سے بہت متاثر تھا۔ لیکن جلد ہی اُردو شاعری سے نا آسودہ ہونے لگا۔ اُس میں لفاظی، اور سطحیت کی بہتات اور رمزیت کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اُس وقت اپنے آپ کو مطمئن کرنے میں میر نے میری بہت امداد کی۔ میر کے علاوہ اُردو میں غالب۔ آتش، انگریزی میں ورڈز ورتھ اور کیٹس، اور ہندی میں تلسی داس سے بھی متاثر ہوں۔"

"کیا آپ اِس کُلیے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔"

فراق صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک آدمی کے کردار کی ساخت میں مختلف قوتیں کار فرما رہتی ہیں۔ جیسے والدین کا خون، گھریلو زندگی، سماجی روایات ـــــ میں جس زمانہ میں پیدا ہوا اُس زمانہ کے حالات اور تعلیم و تربیت اور پھر اچھے آدمی کا معیار بھی ہر ماحول میں علیحدہ ہوتا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ جو اچھا شاعر ہوگا وہ کسی ماحول میں بھی بُری زندگی کا معاون نہیں ہو سکتا۔ وہ ظلم اور بے دردی کی کبھی حمایت نہیں کر سکتا۔" بولتے بولتے فراق صاحب کھو سے گئے۔ اور چند لمحوں تک چُپ چاپ کچھ سوچتے رہنے کے بعد بولے ـــ "ایک اچھے شاعر میں جنسی کمزوریاں ہو سکتی

ہیں۔ اُس کی جنسی زندگی غیر متوازن ہوسکتی ہے۔ وہ شراب کا عادی بن سکتا ہے، نیک نیتی کے باوجود اُس سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوسکتا ہے یعنی وہ خلوص کے ساتھ کسی مسئلے میں غلطی کرسکتا ہے لیکن شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کا مقصد نیکی کی قوتوں کو مدد پہنچانا ہے۔ اِس لئے سماج کی بہبودی کیلئے ایک اچھا شاعر بہرصورت معاون ثابت ہوگا۔"

فراقؔ صاحب کی زبان سے شراب کا ذکر سُن کر میں نے اگلا سوال شراب ہی سے متعلق کیا۔ "کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟"

فراقؔ صاحب نے ایک دم تردید کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جوشؔ، جگرؔ اور میں اپنے اپنے طور پر الگ الگ شراب کے سلسلے میں اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شعر کا کوئی تعلق شراب سے نہیں ہے۔ کسی نشہ باز فن کار نے کبھی نشے کے زیر اثر اپنا کوئی شاہکار نہیں لکھا۔ ٹیگور کو دیکھیے وہ کبھی شراب نہیں پیتے تھے۔ اقبالؔ نے بھی جوانی میں ضرور پی۔ لیکن بعد ازاں اُسے مطلقاً ہاتھ نہیں لگایا۔ داغؔ نے اتنی چلبلی اور رنگین شاعری کرنے کے باوجود شراب کو چھوا تک نہیں۔ چکبستؔ، انیسؔ اور نظیرؔ کے بارے میں بھی کسی نے نہیں سُنا کہ وہ پیتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک آدھ پیگ پی لینے کے بعد شاعر باتیں بہت اچھی کرسکتا ہے۔ لیکن شعر نہیں کہہ سکتا اور زیادہ پینے کے بعد تو ظاہر ہے ڈھ سو ہی جائے گا۔ اور شراب کا نشہ اُترنے کے بعد بھی اُس سے اچھی تخلیق کی توقع لاحاصل ہے۔"

"تو پھر یہ فرمائیے کہ آپ کیوں پیتے ہیں؟"

فراقؔ صاحب کچھ غمگین ہو کر کہنے لگے۔ "میری ازدواجی زندگی جہنم کی طرح اذیت ناک رہی ہے۔ میری شادی غلط ہوگئی تھی

گھر کی برکتوں کو کھو کر دولت اور شہرت حاصل کرنے کے باوجود میرے دل کی ہائے ہائے نہیں مٹ سکتی تھی، حالانکہ میں بڑا چنّم آدمی ہوں۔"

"چنّم ——— ؟" میں سوالیہ نظروں سے فراق صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

"جی ہاں چنّم ——— یہ ہمارے علاقے کی بولی ہے۔ غالباً آپکے پنجاب میں یہ لفظ نہیں بولا جاتا چنّم یعنی چہ غم" اور پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے فراق صاحب نے کہنا شروع کیا۔" ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ گھریلو زندگی کی تلخی نے مجھے شراب کی تلخی کا عادی بنا دیا۔ ۴۲ سال کی عمر کے بعد سے اسے روزانہ پی رہا ہوں۔ اب تو دوسرے عادی شراب نوشوں کی طرح نیند کیلئے بھی اُس کا پینا میرے لئے ضروری ہوگیا ہے۔ لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی کردار پر شراب کا اثر کچھ زیادہ اچھا ثابت نہیں ہوتا۔"

"پھر تو اِس کا مطلب ہے کہ ———" میں نے مسکراتے ہوئے کہا ——"آپ حکومت کی امتناعِ شراب کی پالیسی کے بھی حامی ہوں گے؟"

"بڑے شریر ہیں آپ!" فراق صاحب بہت سنجیدگی سے کہنے لگے —"قانون بنا کر شراب نوشی کی ممانعت نہیں کرنی چاہیئے سماج کو ایسی فضا پیدا کرنی چاہیئے کہ.........."

"سماج کو ایسی فضا کیونکر پیدا کرنی چاہیئے؟" میں نے فراق صاحب کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سوال آپنے بہت اہم کیا ہے" فراق صاحب اپنی آنکھیں

مُسکاتے ہوئے بولے۔" خاندانی روایتوں کے اثر سے مزاج ہی ایسا بنادینا چاہیے کہ انسان شراب سے دور رہے جیسے ہندو گائے کا یا مسلمان سؤر کا گوشت نہیں کھاتے۔ لیکن ایسا کرنے کی راہ میں دقتیں بہت ہیں۔ بہر کیف دُنیا بھر کے مفکروں کیلئے یہ مسئلہ خاصا پریشان کُن ہے، بلکہ اب تو روس کیلئے بھی یہ ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ شراب نوشی سے اگر ایک فیصدی یا نصف فیصدی لوگ بھی برباد ہو جاتے ہیں تو یہ بہت بڑے سماجی نقصان کا باعث ہے۔"

"فراقؔ صاحب! ایک نہایت عام سا سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔" میں نے بہت انکسار سے کہا۔" وہ یہ کہ آپ شعر کیوں کر کہتے ہیں؟"

"شعر کیوں کر کہتا ہوں؟" فراقؔ صاحب نے آہستہ سے کہا جیسے خود اپنے آپ سے یہ پوچھ رہے ہوں اور پھر کہنے لگے۔" ہوتا یہ ہے کہ کوئی ایک مصرعہ اچانک گونجتا ہوا تحت الشعور سے شعور میں آجاتا ہے اور پھر یہی مصرعہ بعد میں یکسوئی کے ساتھ پوری غزل کہلانے کا محرک بنتا ہے۔ لیکن یہاں اِس بات کا خیال رکھیے کہ مختلف شاعروں کے ذہن میں اُن کی وجدانی شخصیت کے مطابق مصرعے ذہن میں آتے ہیں۔ مثلاً داغؔ کے ذہن میں چھیڑ چھاڑ کے مصرعے آتے ہونگے لیکن میرے یہاں مصرعے کیفیت، اثر، نرمی اور گھلاوٹ لے کر آتے ہیں۔"

"گُستاخی معاف۔ آپ اتنی لمبی لمبی غزلیں کیوں کہتے ہیں؟"

"اِس کی دو وجہیں ہیں۔" فراقؔ صاحب نے بلا تامل

بہت تحمل کے ساتھ جواب دیا۔
"میں نے جوانی میں لکھنؤ کے شاعروں کے دیوان پہلے دیکھے اور دہلوی شاعروں کے بعد میں، امیر اور وزیر وغیرہ اکثر سہ غزلہ اور چہار غزلہ تک کہتے تھے۔ اُنہیں کی تقلید میں لمبی لمبی غزلیں کہنے کا میں بھی عادی ہوگیا۔ اور دوسری وجہ جو اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ میں جب فکرِ سخن کرتا ہوں تو روایتی انداز میں شعر نہیں کہتا ہوں میرے ذہن پر ایک موڈ طاری ہوجاتا ہے۔ کائناتِ حُسن وعشق اور زندگی کی معنویت مجھ پر چھا جاتی ہے۔ میرا ہر شعر حُسن، عشق اور زندگی کی کسی خاص کیفیت کا ایک تھرتھراتا ہوا لبریز پیالہ ہوتا ہے۔ میرے دوست مجنوں گورکھپوری نے میرے متعلق بہت اچھی بات کہی ہے۔ کہ میں مزاجاً نظم گو تھا۔ لیکن طبیعت میں انتشار کی وجہ سے غزل کہنے لگا۔ میں منطقی تسلسل سے شعر نہیں کہتا، ایک خاص عالم میں ڈوب کر اُس کی مختلف کیفیتوں کو نظم کرنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ میں شعر پر مسلط نہیں ہوتا، شعر مجھ پر مسلط ہوتا ہے، اِس اعتبار سے میں قادرالکلام نہیں بلکہ عاجزالکلام ہوں۔ عام شاعر موزوں کلام میں نثر کہتے ہیں لیکن میں جمالیاتی حقائق پر نظر رکھتا ہوں۔"

"بے شک۔ بے شک۔" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

"اور سُنئے ــــ"

فراق صاحب نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں بیدل کی طرز میں بھی شاعری نہیں کرتا۔ جو غریب غالب تک کیلئے بھی مصیبت کا موجب تھی۔

طرزِ بیدل میں شاعری کرنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

میرے اچھے اشعار اسرارِ حیات کے مظہر ہیں اس کے باوجود ایک بہت پڑھے لکھے آدمی اور ایک معمولی پڑھے لکھے آدمی کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں، جیسے میرا یہ شعر سُن کر ؎

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست
سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

ایک عام آدمی بھی اُسی طرح اُداس ہو جاتا ہے۔ جس طرح کوئی خاص باذوق آدمی۔"

اور اتنا کہتے کہتے فراقؔ صاحب پھر اپنے ہاتھوں میں تکلیف محسوس کرنے لگے اور اِس کے ساتھ ہی سردی لگی اور اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک کمبل میں لپیٹ لیا۔

"فراقؔ صاحب! آپ کو اب آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں بھائی!" فراقؔ صاحب نے بہت حسرت ناک لہجہ میں میری تائید کرتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھ دیا ع

"اب عناصر میں اعتدال کہاں"

"پوچھنا تو بہت کچھ چاہتا تھا۔ لیکن اس انٹرویو کے سلسلے کو ختم کرنے سے پہلے اتنا بتانے کی تکلیف ضرور گوارا فرمائیے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟"

"فراقؔ صاحب نے سچ مچ کسی قدر نہیں بلکہ بہت حد تک تکلیف سے کہنا شروع کیا۔

"جو ہندی ادب بنایا جا رہا ہے، کروڑوں آدمیوں کی بول چال سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اِس ادب کے جس حصّے کا ہماری بولی سے کچھ تعلق ہے بھی، وہ ہماری بولی کے نہایت پھُوہڑ، کمزور اور بے جان نمونے پیش کرتا ہے۔ ہماری بولی کبھی موجودہ ہندی ادب کے مطابق نہ ہوگی۔ عام لوگ آج کا ہندی ادب پڑھ کر جھوم نہیں سکتے۔ حسین شکل میں جو بولی آج مستعمل ہے، وہ صرف اُردو ہے۔"

"لیکن فراقؔ صاحب! ہماری نئی نسل تو اُردو سے ناواقف ہے، اُردو کا مستقبل تو آخر اُسی سے وابستہ ہے۔" میں نے کہا۔

فراقؔ صاحب پُر اعتماد لہجہ میں بولے۔ "اِس کے باوجود میں اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، یہ درست ہے کہ اُردو کے ادبی ارتقار کی رفتار کم ہو جائے گی لیکن ہماری بولی ہندی کے موجودہ ادب کے مطابق تو کبھی نہ ہوگی۔ اُردو کے ساتھ یہ بے انصافی دیر تک نہیں ہو سکتی۔ سات آٹھ برس کے بعد یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کے بعد اُردو سے انصاف ضرور ہوگا۔"

"بڑی آواز لگے اور مدینے۔" میں نے ہنستے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا اور فراقؔ صاحب کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔

★

غزلیں

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اِس ترکِ تعلق کا بھروسا بھی نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

بدگماں ہو کے مِل اے دوست جو ملنا ہے تجھے
بے جھجکتے ہوئے ملنا، کوئی ملنا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اُٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

فطرتِ حُسن تو معلوم ہے تجھ کو ہمدم!
چارہ ہی کیا ہے بجز صبر، سو ہوتا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بیگانوں میں
لیکن اُس جلوہ گہہ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

شکوۂ جور کرے کیا کوئی اُس شوخ سے، جو
صاف قائل بھی نہیں، صاف مکرتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست!
آہ! اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

مدّتیں گزریں، تری یاد بھی آئی نہ ہمیں!
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

منہ سے ہم اپنے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ !
ہے ترا دوست، مگر آدمی اچھا بھی نہیں

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پَو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو، اُس کی رہگذر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی، لیکن !
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

کہیں زمان و مکاں میں ہے نام کو بھی سکوں
مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

دلوں میں آج تری یاد مدتوں کے بعد
بہ چہرۂ متبسم، بہ چشمِ تر آئی

نیا نہیں ہے مجھے مرگِ ناگہاں کا پیام
ہزار رنگ سے اپنی مجھے خبر آئی

فضا کو جیسے کوئی راگ چیرتا جائے
تری نگاہ دلوں میں یونہی اُتر آئی

ذرا وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

ترا ہی عکس سرشکِ غمِ زمانہ تھا
نگاہ میں تری تصویر سی اُتر آئی

عجب نہیں کہ چمن در چمن بنے ہر پھول
کلی کلی کی صبا جا کے گود بھر آئی

شبِ فراق اُٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

مری نظریں بھی ایسے کافروں کی جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

جسے کہتی ہے دُنیا کامیابی، وائے نادانی!
انہیں کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں

محبت اپنی گھبرانی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا!
اُسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں
ہم آہنگی میں بھی اِک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بہ عنوانِ دِگر وہ مان لیتے ہیں
اب اِس کو کفر مانیں یا بلندیٔ نظر جانیں!
خدائے دو جہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں
تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ اُلفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر احسان لیتے ہیں
زمانہ وارداتِ قلب سُننے کو ترستا ہے
اِسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں
فراقؔ اکثر بدل کر بھیس پھرتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں، کبھی پہچان لیتے ہیں

رباعیاں

لہروں میں کِھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ، یہ لوچ، یہ ترنم یہ نکھار
بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

دوشیزہ بیٹھکڑی کو شبنم دھو جائے
جیسے شعلوں کی جگمگاہٹ کھو جائے
پچھلے کو خمارِ جسمِ نازک جیسے
کلیوں کے لبوں پہ مسکراہٹ سو جائے

ہر جلوے میں اک درس نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار! تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

نغمے کی الاپ ہے کہ جوبن کا تناؤ
قامت کی کماں، دہکتے شعلوں کا چڑھاؤ
آ آ کے راگنی کھڑی ہوتی ہے
دیکھے کوئی سجل بدن کا یہ رچاؤ

آنسو سے بھرے بھرے یہ نیناں رس کے
ساجن کب لے سکھی تھی اپنے بس سے
یہ چاندنی رات، یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

ہے روپ میں وہ کھٹک وہ رس وہ جھنکار
کلیوں کے چٹکتے وقت جیسے گلزار
یا نور کی انگلیوں سے دیوی کوئی
جیسے شبِ ماہ میں بجاتی ہو ستار

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق!
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

اشعار

وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہی دل نہیں بھولا
پڑی جب جب نظر تیری نگاہِ اوّلیں نکلی

بہت نہ بیکسیٔ عشق پر کوئی روئے
کہ حُسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں

میں آسمانِ محبت سے رخصتِ شب ہوں
ترا خیال کوئی ڈوبتا ستارا ہے

نہ خونِ منصور ہے شفق پر، نہ قتلِ سرمد کی داستاں ہے
اب اس سے اُدُوں کی صبح ہوگی جو نعرۂ گیر و دار ہوگا

کھُلیں نہ حُسن کی فطرت کے راز عاشق پر
برت خلوص کبھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا

بہت دلوں میں محبت کو ہوسکا معلوم
یہی کہ تجھ کو ضرورت نہیں محبت کی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

اِس دَور میں زندگی بشر کی!
بیمار کی رات ہو گئی ہے

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست!
سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

اس کی شیطان کو کہاں توفیق
عشق کرنا گناہِ آدم ہے

تو یاد آئے، ترے جور و ستم لیکن نہ یاد آئیں
تصور میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے

شریکِ بزم ہو کر یوں اُچٹ کے بیٹھنا تیرا
کھٹکتی ہے تری موجودگی میں بھی کمی تیری

بہت آہستہ اُٹھتی ہے نگاہِ شاعرِ فطرت
رُخِ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے

تو ایک تھا، مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اِک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

منزلیں گرد کے مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دُنیائے آرزو نہ بنا

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایا

شگفتگی تو ہے پھر بھی شگفتگی، لیکن
فسردہ ہو کے وہ کچھ اور بھی نکھرتا ہے

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراقؔ! کہ میں مسکرا دیا

شاعر ہوں، گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں
چونکا رہے ہیں اُن کو بھی میرے توہمات

ازل سے سینۂ جبریل جس سے ہے محروم
قفس میں پال رہا ہوں وہ حسرتِ پرواز

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ!
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

حُسن کو اک حُسن ہی سمجھے نہیں، اور اے فراقؔ
مہرباں، نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

شام بھی تھی دُھواں دُھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں، یاد سی آ کے رہ گئیں

ہزار شکر کہ مایوس کردیا تو نے!
یہ اور بات ہے تجھ سے بھی کچھ اُمیدیں تھیں

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حُسنِ یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں!

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمّت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دُنیا میں
ارے وہ دردِ محبّت سہی تو کیا مر جائیں؟

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

اِس پُرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی؟

سردار جعفری

فکر و فن کے بہت سے دشوار گزار ارتقائی
مراحل سے گزر کر آج سردار جعفری کی نظر میں جو
گہرائی پیدا ہو چکی ہے وہ اُن کی تخلیقات کو بہت
اہم اور وقیع بنانے کا باعث ہے۔ بلاشبہ
اب اُن کی شاعری میں انسانی عظمت کا بھرپور
احساس پھول میں خوشبو کی طرح رچ بس گیا
ہے۔ نئی زندگی کی دھڑکنیں تو خیر ہمیشہ ہی
سے اُن کی شاعری میں واضح طور پر سُنائی
دیتی رہی ہیں لیکن اب تو وہ بڑی فنی چابکدستی
سے اپنے انفرادی تاثرات، ذاتی خیالات اور
مخصوص نظریات کو آفاقی حقیقتوں کا جزو
بنا رہے ہیں۔

شاد: کیوں حضرت! یہ سردار جعفری آپ کا نام ہے یا تخلص؟

جعفری: علی سردار میرا نام ہے جعفری سیدوں کی ذات ہے۔
یعنی میرے خاندانی نام کا ایک حصہ ہے۔ تخلص کوئی نہیں ہے۔

شاد: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جعفری: ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور میں۔

شاد: تعلیم کہاں کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی؟

جعفری: بلرام پور، علی گڑھ، دہلی اور لکھنؤ سے۔ ڈگری اگرچہ
بی اے کی ہے۔ لیکن پڑھا ایم اے تک ہوں۔ انگریزی لٹریچر
میں ایم اے فائنل کا امتحان نہیں دے سکا۔

شاد: شاعری کا آغاز کب ہوا؟

جعفری: بچپن ہی میں ہو گیا تھا، کیوں کہ انیس کی وجہ سے گھر میں
شاعری کا ماحول تھا۔

شاد: کیا میں آپ کا سب سے پہلا شعر سن سکتا ہوں؟

جعفری: اب یاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ میری شاعری کا آغاز
مرثیوں سے ہوا تھا۔ جن کی زبان، تشبیہیں، استعارے
اور ترتیب، ہر چیز انیس کی ہوتی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں ہوتا تھا

شاد: کسی ابتدائی مرثیے کے کچھ شعر یاد ہوں تو فرمایئے۔

جعفری: پہلا مرثیہ جو کہا تھا وہ کچھ اِس طرح شروع ہوتا تھا۔

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے
اللہ رے حُسن فاطمہؑ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھُپتا پھرتا ہے نورِ آفتاب کا

اور آخری دو مصرعے تھے،

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھُلاؤں گی

شاد: آپ نے ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی؟

جعفری: کسی سے بھی نہیں۔

شاد: شروع میں کِس کِس اُردو شاعر سے آپ خاص طور پر متاثر ہوئے؟

جعفری: انیس۔ غالب۔ اقبال اور جوش سے۔

شاد: آپ کے نزدیک اِس صدی کا بہترین اُردو شاعر کون ہے؟

جعفری: اقبال۔

شاد: اور آپ کی نظر میں بہترین شعر کی تعریف کیا ہے۔؟

جعفری: طالبِ علمانہ باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ جس میں جذبے کی شدّت ہو، بندش کی چستی ہو، تشبیہہ اور استعارے کا حسن ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ حُسن کی طرح شعر کی بھی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

شاد: آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟

جعفری: یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔

شاد: اپنے ہم عصر شاعروں میں کون کون سے شاعر آپ کو خاص ' در پر پسند ہیں؟

جعفری: فیض، جذبی، مخدوم اور ن۔م۔راشد ۔۔ لیکن "ماورا" کے بعد کا راشد پسند نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی نظم " ایران میں اجنبی" کے بارے میں پطرس کا کہنا ہے کہ وہ ایشیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن یہ اُن کی ذاتی رائے ہے جس سے میں اتفاق نہیں کرتا۔

شاد: غیر ملکی شاعروں میں آپ کس کس سے متاثر ہوئے؟

جعفری: بہت طویل فہرست ہے، بہتوں نے متاثر کیا، انتخاب بہت مشکل ہے۔

شاد: آپ کی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہے۔؟

جعفری: ایک آدھ نہیں، ایسے کئی واقعات ہوں گے۔ لیکن اِس وقت کوئی یاد نہیں آرہا۔

شاد: کیا نئی نسل کے اُردو شاعروں میں کوئی قابل ذکر شاعر بھی ہے؟

جعفری: یہ نئی اور پُرانی نسل کا سوال ہی غلط ہے۔ فراق حالانکہ جوش کی نسل کے ہیں۔ لیکن نمائندگی ہماری نسل کی کرتے ہیں۔ اختر الایمان بہت دیر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ لیکن اُنہیں نئی نسل کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔

شاد: شاعری کے علاوہ ادب کی کن کن دوسری اصناف سے آپ کو

دل چسپی ہے؟

جعفری: لکھنے یا پڑھنے کی حد تک؟

شاد: دونوں کی حد تک

جعفری: پڑھنے کی حد تک تو ہر صنفِ ادب تک سے دلچسپی ہے۔ اور لکھنے کی حد تک شاعری کے علاوہ تنقید اور کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں۔

شاد: سیاست سے آپ کب اور کس طرح وابستہ ہوئے؟

جعفری: طالب علمی کے زمانہ میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اِس تحریک میں شامل ہو گیا۔ خاص طور پر متاثر کرنے والا جواہر لال نہرو تھے۔

شاد: سیاست سے گہری وابستگی نے آپ کے ادب پر کیا اثر ڈالا؟

جعفری: کسی حد تک اچھا اثر ڈالا۔ کسی حد تک بُرا بھی۔

شاد: کس طرح؟

جعفری: اچھا اِس طرح کہ میں باشعور ادب پیش کر سکا اور بُرا اِس طرح کہ اس میں سیاست کا رنگ ضرورت سے زیادہ گہرا ہو گیا۔

شاد: رنگ گہرا ہونے سے مُراد غالباً خطابت کی فراوانی ہے۔

جعفری: نہیں، خطابت کو میں بُری چیز نہیں سمجھتا۔ آخر قرآن اور انجیل میں بھی تو خطابت ہے۔

شاد: تو پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

جعفری: کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ اچھی شاعری کو زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں پر حاوی

ہونا چاہیے۔ اِس ضمن میں اب میں احتیاط کر رہا ہوں۔

شاد: آپ کے خیال میں کیا ہر ادیب کو آپ ہی کی طرح کسی سیاسی پارٹی سے سو فیصدی وابستہ ہو جانا چاہیے۔؟

جعفری: ضروری نہیں۔

شاد: ادب اور سیاست کے علاوہ آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

جعفری: فلموں میں بھی جھک مارتا ہوں لیکن سیاست میرا مشغلہ تو نہیں ہے۔ میں سیاست سے واقف ضرور ہوں اور اُس سے دلچسپی بھی رکھتا ہوں، لیکن یہ میرا مشغلہ نہیں ہے۔

شاد: حُبّ الوطنی اور بین الاقوامی اخوت میں آپ کِسے ترجیح دیتے ہیں؟

جعفری: کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حُبّ الوطنی فاشزم بھی بن سکتی ہے اور بین الاقوامی اخوت حُبّ الوطنی سے فرار کا باعث بھی ہو سکتی ہے جب الوطنی تو انسانی خون میں ہوتی ہے، اُسے کوئی نہیں چھین سکتا یہاں تک کہ وطن کا غدّار بھی اُس سے پورے طور پر دامن نہیں چھُڑا سکتا اور بین الاقوامی اخوت، تربیت یافتہ ذہن کی چیز ہے۔ میرے خیال میں اِن دونوں میں توازن ہونا چاہیئے۔

شاد: کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟

جعفری: نہیں بھائی، شعر تو پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

شاد: تو آپ شراب کیوں پیتے ہیں؟

جعفری: اچھی لگتی ہے، اِس لئے۔ اِس کا سرور اچھا لگتا ہے، اُس سے لُطف حاصل ہوتا ہے۔ صحیح حدود کے اندر پی جائے تو صحت

کے لئے بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔

شاد: آپ کے خیال میں کیا اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

جعفری: ضروری نہیں۔

شاد: کیا ادب، ادیب کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے؟

جعفری: بالکل ہوتا ہے۔

شاد: کیا آپ عروض سے واقف ہیں؟

جعفری: واقف ضرور ہوں لیکن اتنا نہیں جتنا اساتذہ

شاد: معاف کیجئے، یہ بہت مبہم جواب ہے۔

جعفری: بھئی بات یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں جب میں اردو کا طالب علم تھا تو مولانا احسن مارہروی میرے اُستاد تھے۔ جنہوں نے باقاعدگی سے مجھے عروض پڑھایا ہے۔ میں بحروں سے واقف ہوں۔ تقطیع کر سکتا ہوں، زحافات کو جانتا ہوں۔ لیکن اِس کے باوجود میرے کلام میں ایسی بہت سی چیزیں ہوں گی جو عروض کے اعتبار سے غلط ہوں گی۔

شاد: کیا عروض کا جاننا شاعر کیلئے لازمی ہے۔؟

جعفری: اچھے شاعر عروض سے ضرور واقف ہوتے ہیں۔

شاد: ہمارے بہت سے اچھے شاعر عروض سے ناواقف ہیں۔

جعفری: مثلاً؟

شاد: مثلاً اختر شیرانی۔

جعفری: اختر شیرانی اُن بڑے شاعروں کی صف میں نہیں ہیں جس میں میر۔ غالب۔ اقبال اور جوش ہیں۔

شاد: لیکن جوشؔ صاحب نے بھی مجھے خود بتایا ہے کہ وہ عروض نہیں جانتے۔

جعفری: جانتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے اُنہوں نے جھوٹ بولا ہے کہ نہیں جانتے، جب روسی حکومت یہ کہتی ہے کہ ہمارا پلان فیل ہو گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہوتا ہے کہ سوویٹ یونین میں قحط پڑ گیا ہے۔ جوشؔ صاحب جب یہ کہیں کہ میں عروض سے واقف نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عروض سے ناواقف ہیں۔

شاد: بہت خوب، جواب نہیں جعفری صاحب آپ کا بھی! مُدّعی سُست گواہ چست شاید اسی موقع کیلئے بولتے ہیں۔ خیر! اب یہ بتایئے کہ کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار ہے؟

جعفری: نہیں، جمود کا شکار تو نہیں، البتہ حالات کا اثر ضرور پڑ رہا ہے۔ وہ اثر یہ ہے کہ علمی سرمایہ کم ہو رہا ہے۔

شاد: اُردو غزل کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جعفری: غزل بطور صنفِ سخن کے باقی رہے گی۔ لیکن رشید احمد صدیقی فراقؔ اور سرورؔ کی اِس بات کو مبالغہ پر محمول کرتا ہوں کہ غزل نظم پر حاوی ہے۔ میرے خیال میں اُردو شاعری کی عظمت اور اُس کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے۔

شاد: غزل کے مستقبل کی بات چھوڑیے، یہ فرمایئے کہ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

جعفری: اگر یہی صورتِ حال رہی تو اچھا نہیں اور اگر اِس میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی تو پچھلے پندرہ سال میں

اُردو نے جو کچھ کھویا ہے وہ حاصل ہو جائے گا۔ حالات بظاہر اچھے نظر نہیں آتے۔ قطعی جواب دینا بہت مشکل ہے۔

شاد: کیا آپ اِس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان میں اُردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے؟

جعفری: پہلے اِس سے متفق تھا۔ لیکن اب نہیں ہوں۔

شاد: وہ کیوں؟

جعفری: رسم الخط سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُردو زبان کو تعلیم اور ایڈمنسٹریشن سے بے تعلق کیا جا رہا ہے۔ ایسا ہونے سے رسم الخط کی تبدیلی کے باوجود اُردو زبان کو نقصان پہنچے گا۔ اُردو زبان خواہ کسی بھی رسم الخط میں ہو اُسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے جب نظم ونسق اور تعلیم میں بھی اُس کا استعمال ہو، ویسے اُردو والوں کو دونوں رسم الخطوں سے واقف ہونا چاہئے۔ اور اگر اُردو ادیب ہندی سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تو اور بھی اچھا ہے اِس سے اُردو بہتر ہو سکے گی۔

شاد: اچھا جناب! اب ذرا ترقی پسند ادب کی تحریک سے متعلق کچھ فرمایئے۔ یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک اب ختم ہو چکی ہے۔

جعفری: جی ہاں، اب پل آگیا ہے، حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنا رول ادا کر کے چلی گئی۔ دنیا مت

تک تو کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

شاد: یہ بھی بتانے کی زحمت فرمایئے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک نے کیا رول ادا کیا ہے؟

جعفری: ادب کو نیا خیال اور نیا مواد بخشا ہے۔ آج اُردو ادب میں جو بڑے نام نظر آتے ہیں وہ اسی تحریک کی دین ہیں فیض مخدوم اور فراق نے اپنی آواز اِسی تحریک کے زیر اثر پہچانی ہے۔ فراق کی غزلوں میں جو عظمت آئی ہے وہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے، یہ دوسری بات ہے کہ آج وہ اس کا اعتراف شاید کھل کر نہ کریں۔

شاد: کیا اِس تحریک کی موجودہ حالات میں ضرورت نہیں ہے؟

جعفری: جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں، اب حالات بدل گئے ہیں۔ نئے شعور کی آج بھی ضرورت ہے۔ لیکن تحریک کی شکل میں نہیں۔

شاد: اِس موضوع کو بھی چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کہ آپ کے اب تک کے کہے ہوئے کلام میں آپ کو اپنی کون کون سی نظمیں خاص طور پر پسند ہیں؟

جعفری: یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ ویسے مجھے اپنی نظمیں "میرا سفر" "پتھر کی دیوار" اور نیند بہت پسند ہیں۔ اُدھر جو نئی نظمیں کہی گئی ہیں اُن میں "پیغمبرِ مسیحا دست۔" اور "قتل آفتاب" مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔

شاد: کیا موجودہ مشاعرے آپ کے خیال میں اُردو کی ترویج و

اشاعت کے لئے سودمند ہیں۔

جعفری: مشاعروں کی اِس اعتبار سے اہمیت تو ہے کہ لوگوں تک کچھ چیزیں پہنچتی ہیں۔ لیکن سامعین کی زیادہ تر تعداد اُردو سے ناواقف ہے اِس لئے مشاعروں کا علمی اور ادبی معیار گر رہا ہے۔

شاد: آپ جس مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے دہلی تشریف لائے ہیں اُس کا وقت ہو چکا ہے۔ اِس لئے اب میں تو اجازت چاہوں گا اور آپ مشاعرے کے علمی اور ادبی معیار کو سنبھالا دیجئے۔ اچھا آداب عرض۔

قتلِ آفتاب

شفق کے رنگ میں ہے قتلِ آفتاب کا رنگ
افق کے دل میں ہے خنجر، لہولہان ہے شام
سفید بارشِ نور اور سیاہ بارشِ سنگ
زمیں سے تا بہ فلک ہے بلند رات کا نام

یقیں کا ذکر ہی کیا ہے کہ اب گماں بھی نہیں
مقامِ درد نہیں، منزلِ فغاں بھی نہیں
وہ بے حسی ہے کہ جو قابلِ بیاں بھی نہیں
کوئی ترنگ ہی باقی رہی نہ کوئی اُمنگ
جبینِ شوق نہیں، سنگِ آستاں بھی نہیں
رقیب جیت گئے ختم ہو چکی ہے جنگ
دلوں میں شعلۂ غم بجھ گیا ہے کیا کیجے
کوئی حسین نہیں کس سے اب وفا کیجے
سوائے اِس کے کہ قاتل ہی کو دعا دیجے

مگر یہ جنگ نہیں وہ جو ختم ہو جائے
اِک انتہا ہے فقط حسنِ ابتدا کے لئے
سمجھے ہیں خار کہ گزریں گے قافلے گُل کے

خموشی مہر بہ لب ہے کسی صدا کیلئے
اُداسیاں ہیں یہ سب نغمہ و نوا کیلئے

وہ پہنا شمع نے پھر آفتابِ خون کا تاج
ستارے لے کے اُٹھے نورِ آفتاب کے جام
پلک پلک پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ
لویں لچکتی ہیں یا بجلیاں چمکتی ہیں
تمام پیرہنِ شب میں بکھر گئے ہیں شرار

ہزار لب سے زمیں کہہ رہی ہے قصۂ درد
ہزار گوشِ جنوں سُن رہے ہیں افسانہ

چٹک رہی ہیں کہیں تیرگی کی دیواریں
لچک رہی ہیں کہیں شاخِ گُل کی تلواریں
سنک رہی ہے کہیں دستِ سرکشی میں ہوا
چہک رہی ہے کہیں بلبلِ بہار نوا
مہک رہا ہے وفا کے چمن میں دل کا گلاب
چھلک رہی ہے لب و عارض و نظر کی شراب

جوان خوابوں کے جنگل سے آ رہی ہے نسیم
نفس میں نکہتِ پیغامِ انقلاب لئے

خبر ہے قافلۂ رنگ و نور نکلے گا
سحر کے دوش پہ اک تازہ آفتاب لئے

پیغمبرِ مسیحا دست

سُنا ہے آئے گا پیغمبرِ مسیحا دست
قدیم عہد کی صورت، نئے زمانے میں
صلیب و دار کو ہو گا عدالتوں سے عروج
دروغ رنگ بھرے گا ہر اک فسانے میں

صدائے حُسن و صداقت لہو میں ڈوبے گی
کریں گے دوست بھی اقرارِ دوستی سے گریز
تُلے گی چاندی کے سکوں میں دل کی جنسِ وفا
ہوائیں تیغ بکف ہوں گی شاخِ گل خوں ریز

۲

نشیب خاک بھرے گا قمار خانوں سے
فرازِ دار پہ ہو گا پیمبری کا مقام
گھٹا کی طرح سے جھومیں گے تیرگی کے نشاں
سیاہ رو نظر آئے گا آفتاب کا جام

سُنا ہے نکلے گی میلادِ نو کے جشن کی بات
صلیبِ ظلم سے اُترے گی پھر مسیح کی لاش
نقوشِ پا کے قدم بحر و بر پہ چمکیں گے
بڑھے گی اور بھی کچھ دل شکستگاں کی تلاش

وفورِ نور سے معمور ہو گا دیدۂ کور
کرن کی طرح سے بالیدہ اُنگلیاں ہوں گی
سروں پہ سایۂ رحمت بنیں گے دستِ شفیق
جبینِ درد سے پیدا تجلّیاں ہوں گی

نکالے جائیں گے پھر زندگی کے معبد سے
بشر کے اشکوں کے تاجر، لہو کے بیوپاری
خدا کے نام کو نیلام کر نہ پائیں گے
وہ چاہے صاحبِ تسبیح ہوں کہ زنّاری

وہ ہاتھ بڑھ کے سنبھالیں گے کائنات کی باگ
نہا چکے ہیں مشقت کے جو پسینے سے
جراحتِ دل و جاں مندمل کرینگے وہ ہاتھ
نشاں ہیں جن کی ہتھیلی پہ سخت کوشی کے

وہ ہاتھ جن کو پہنائی گئی ہیں زنجیریں !
وہ ہاتھ چھید چکی ہے جنہیں صلیب کی کیل
وہ ہاتھ شعلۂ حق بن کے ہو رہے ہیں بلند
اندھیری رات ہے روشن ہے صبحِ نو کی دلیل

وہی مسیحؑ و محمدؐ، وہی کلیمؑ و خلیلؑ
وہی حسین و دل آرا، وہی جلیل و جمیل

میرا سفر

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمہلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
اِک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی
خون کی گردش، دل کی دھڑکن

سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یا میری جنت، میری زمیں
اُس کی صبحیں اُس کی شامیں
بے جانے ہوئے بے سمجھے ہوئے
اِک مشتِ غبارِ انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بُھلا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچّوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی اُنگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتّی پتّی، کلی کلی

اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
رُخسارِ عروسِ نَو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سُوکھے ہوئے پتّوں سے مرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی!
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصّہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سُلطانہ ہے
میں رنگِ حنا آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں

ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پُرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

ساحرؔ لدھیانوی

دورِ جدید کے شاعروں میں ساحر لدھیانوی اِس
اعتبار سے بہت زیادہ ممتاز حیثیت رکھتے
ہیں کہ احساس کی شدّت اور جذبے کی صداقت
اُن کی شاعری کے بُنیادی عناصر ہیں۔ اور اُنکے
غیر مبہم اندازِ بیاں نے اِن بُنیادی عناصر کے
رنگ، روپ کو اور زیادہ نکھار دیا ہے، اُنکی
پُرخلوص شاعری آج کے ہندوستانی نوجوان
کی ذہنی اور جذباتی کشاکش کی ایک کہانی ہے۔
اپنے محبوب شاعر فیض احمد فیض کی طرح ساحر
بھی ذہنی طور پر انقلابی لیکن محسوساتی اعتبار سے
رومانی شاعر ہیں اور اُنکا جذبۂ عشق بھی جذبۂ انقلابی

"میں کب اور کہاں پیدا ہوا؟"

میرے اِس سوال کو زیرِ لب دُہرا کر ساحر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اے جدت پسند نوجوان! یہ تو بڑا ہی روایتی سوال ہے۔ اِس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اِس میں اتنا اضافہ اور کر لو۔" اور کیوں پیدا ہوا؟"

میں نے جان بوجھ کر اپنے اوپر بے چارگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "آپکی خوش مذاقی مسلّم لیکن ساحر صاحب اِس کا سہارا لیکر آپ ہم غریبوں کے انٹرویو لینے کے شوق کا مذاق کیوں اُڑاتے ہیں۔"

ساحر نے ذرا سا جھینپتے ہوئے قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "۱۹۲۱ء میں لُدھیانہ میں۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی اور پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔ "تعلیم کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی۔؟"

"بی اے نہیں کر سکا ہوں، گورنمنٹ کالج لدھیانہ اور دیال سنگھ کالج لاہور، دونوں سے نکالا ہوا ہوں۔" اور اتنا کہنے کے بعد ساحر کے لہجہ میں جیسے فخر و اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔ "اب اِن دونوں کالجوں کو ناز ہے کہ میں وہاں پڑھتا رہا ہوں اور اب اِس حادثے کا کہ میں وہاں سے نکالا ہوا

یقیناً اُنھیں صدمہ ہے۔"

اور مجھے اُس وقت بے اختیار ساحر کی نظم " نذرِ کالج " کا آخری شعر یاد آگیا ؎

لیکن ہم اِن فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں کے نکالے ہوئے تو ہیں

" اچھا یہ فرمائیے۔ مسٹر عبدالحئی سے آپ حضرت ساحر لدھیانوی کب بنے ؟"

" ۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے جب مجھے بالکل فراغت تھی۔"

" سب سے پہلا شعر کیا تھا ؟"

" یاد نہیں، شاید یاد رکھنے کے قابل بھی نہ ہو۔"

" ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی ؟"

" کسی سے نہیں ـــــ" اور پھر یکایک جیسے ساحر صاحب کو کچھ یاد آیا۔ کہنے لگے۔ " ہاں یہ ضرور ہوا کہ میں نے اپنی سب سے پہلی نظم ایک دوست کے ذریعہ اپنے اسکول کے ٹیچر فیاض ہریانوی کو اُنکی رائے دریافت کرنے کیلئے بھیجی۔"

" تو اُنہوں نے کیا رائے دی ؟"

"یہی کہ اشعار موزوں ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے نظم بہت معمولی ہے۔" اتنا کہہ کر ساحر نے اپنے مخصوص لیکن بڑے محبوب اور دلکش انداز میں کہا۔ " ظاہر ہے اُس وقت میرے لئے یہی بہت تھا کہ اشعار موزوں تو ہیں!"

"آپ نے اپنا تخلص ساحر ہی کیوں تجویز کیا؟"

کرسی سے اُٹھ کر ساحر صاحب کمرے میں ٹہلنے لگے اور ٹہلتے ٹہلتے کہنے لگے "چونکہ کوئی نہ کوئی تخلص رکھنا مروج تھا اور اس رواج کا احترام کرنے کی نیت سے میں اپنے کورس کی کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا تاکہ تخلص کا کوئی اچھا سا لفظ مل جائے، کہ اقبال نے داغ کا جو مرثیہ لکھا ہے اُس میں اس شعر پر نظر پڑی ؎

اِس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہونگے، صاحبِ اعجاز بھی

اپنی شاعری کے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی اور چونکہ میں بھی اپنے آپ کو سینکڑوں میں ایک شمار کرتا تھا، اس لئے اپنے تخلص کے لئے مجھے ساحر مناسب معلوم ہوا۔"

"شروع میں اُردو کے کس کس شاعر سے آپ خاص پر متاثر ہوئے؟"

"اقبال اور جوش ملیح آبادی سے۔"

"اور اب اگر میں یہ دریافت کروں کہ آپ شعر کہتے کیوں ہیں؟"

ساحر نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ دیکھ نہیں رہے ہیں بلکہ مجھے اپنی لمبی نوکیلی ناک سے سونگھ رہے ہیں اور ایک بار پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"میری رائے میں ہر آدمی کا جو پیشہ ہے، اُس میں اُس کا شوق اور ضرورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی شوق پہلے اور کبھی ضرورت، سماجی اور سیاسی نظریے کی تبلیغ کا سوال اسکے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کیلئے اپنے وقت کا ایک

حصہ مجھے فلمی شاعری کی نذر کرنا پڑا۔ اِس کے علاوہ اپنی زندگی کے بعض سانحات کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی میرا ذہن تخلیقِ شعر پر مجبور ہو گیا۔"

یہ سن کر مجھے پھر اُن کا یہ شعر یاد آگیا ؎

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

"اور آپ شعر کہتے کیونکر ہیں؟"

اس کے جواب میں ساحرا اپنے چیچک زدہ چہرے کو سہلاتے ہوئے بتانے لگے۔ بعض اوقات کوئی ذاتی واقعہ یا اجتماعی مسئلہ ذہن پر اِس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ اشعار کے بغیر اُس کا تجزیہ کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اُس وقت کسی خاص ماحول کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے عالم میں کوئی چیز مخل ہوتی بھی ہے، تو مخل ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ فلمی گانا لکھنے کے لئے دروازہ بند کر کے، کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور شعوری طور پر اپنے آپ کو گیت سے متعلق ماحول اور کردار کی نفسیات کے سانچے میں ڈھال کر اشعار کہتا ہوں یا گیت لکھتا ہوں۔"

"اچھے شعر کی آپ کے خیال میں مختصر ترین تعریف کیا ہے؟"

"خوبصورت ہو، سچا اور مفید ہو۔"

"کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور کیا عروض کا جاننا شاعر کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔۔؟"

"میں خود عروض سے ناواقف ہوں، اِس صورت میں عروض کا جاننا شاعر کیلئے ضروری کیونکر سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ایک اچھا شاعر عروض سے واقف ہو تو اُس کے حق میں زیادہ اچھا ہے"

"آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟"

"کئی چھوٹے اور بڑے واقعات ہیں۔ کسی خاص واقعہ کا انتخاب ناممکن ہے۔"

"آپ اِس صدی کا سب سے بڑا شاعر کسے تسلیم کرتے ہیں؟"

"نظریاتی اختلاف کے باوجود اقبال کو۔"

"اُردو کے موجودہ شاعروں میں آپ کو خاص طور پر کونسا شاعر پسند ہے؟"

"مشکل یہ ہے کہ ہمعصر شاعروں کے بارے میں ذاتی پسند کا انحصار فن کار کے علاوہ اُس کی شخصیت پر بھی ہوتا ہے۔ تاہم فیض احمد فیض مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"اور اُردو کے جدید ترین شاعروں میں کوئی قابلِ ذکر شاعر بھی آپ کی نظر میں ہے؟"

"نرلیش کمار شاد۔" ساحر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "حوصلہ افزائی کا شکریہ! لیکن ذرا اور سنجیدگی سے بتایئے۔ میرا مطلب ہے، ذرا حق گوئی سے کام لیجئے۔ تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔"

"حوصلہ افزائی یا تمہیں خوش کرنے کا سوال نہیں۔" ساحر نے اپنی لمبی لمبی انگلیوں کو لہراتے ہوئے کہا۔ "اپنی اِس رائے کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ تصدیق درکار ہو تو کنور مہندر سنگھ بیدی سے پوچھ لینا۔"

اپنے ذکر سے سلسلہ کو ارادتاً منقطع کرتے ہوئے میں نے

دوسرا سوال کیا۔

"آپ کی نظر میں اب تک آپ کی بہترین نظم کون سی ہے ؟"

ساحر نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے کہا ــــــ

" مختلف اوقات میں مختلف نظمیں بہترین نظمیں معلوم ہوتی رہی ہیں۔"

"مثلاً اس وقت کون سی نظم ؟"

" پرچھائیاں "۔ ساحر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

" کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں ؟"

" ہرگز نہیں ــ شعر کہنے کیلئے نشے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ نشے کی حالت میں عام طور پر اچھا شعر کہا ہی نہیں جا سکتا۔"

" تو پھر آپ شراب کیوں پیتے ہیں ؟"

" میں تو بُش شرٹ بھی پہنتا ہوں حالانکہ بُش شرٹ پہننا شاعر کے لئے ضروری نہیں ہے۔"

" شاعری سے قطع نظر آپ کے شراب پینے کی وجہ کیا ہے ؟"

" میں شراب نہیں پیتا تھا۔ جب بمبئی میں شراب بندی ہوئی تھی اُس وقت بھی شراب نہیں پیتا تھا، بعد میں لو بلڈ پریشر کی وجہ سے طبی طور پر میں نے تین چار سال تک شراب کا استعمال کیا۔ اور اُس سے کافی افاقہ ہوا۔ اب البتہ اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ رات کو شراب پیئے بغیر اچھی طرح نیند نہیں آتی۔"

" شاعری کے علاوہ آپ کو ادب کی دوسری اصناف سے کس حد تک دلچسپی ہے۔"

" پڑھنے کی حد تک ہر صنف سے دلچسپی ہے لیکن ـــ " ساحر نے

اُنگلیوں کو اپنے بالوں میں اُلجھاتے ہوئے کہا ــ " شروع شروع میں کچھ کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں اور بعد میں چند تنقیدی مضامین بھی۔"

" کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار ہے ؟"

" جمود حرکت کی ضد ہے، ادب میں حرکت تو ہے، لکھا بھی بہت کچھ جا رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بہت زیادہ بلند پایہ نہ ہو۔"

" آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے ؟"

" میں کبھی کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ غلام ہندوستان میں آزادی کے مثبت پہلو ڈھونڈھنا اور اُن کا پرچار کرنا میرا نصب العین ضرور رہا ہے، اب ذہنی طور پر اقتصادی آزادی کا حامی ہوں جس کی واضح شکل میرے نزدیک کمیونزم ہے۔"

" آپ کے خیال میں ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے ؟"

" ساحر نے ڈپلومیٹک انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

" اُردو زبان کے مستقبل کو ہندوستان کے مستقبل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان ایک ترقّی پسند ملک ہے اور اُردو ایک ترقّی یافتہ زبان، اِس لئے ہندوستان میں اُردو کا وہی مستقبل ہے جو خود ہندوستان کا ہے۔ یعنی جس رفتار سے تعصب اور تنگ نظری میں کمی ہوگی اُسی رفتار سے ملک اور اُردو آگے بڑھیں گے۔"

" اب ذرا ترقّی پسند ادب کی تحریک پر کچھ فرمایئے۔"

" میں سمجھتا ہوں ترقّی پسند تحریک نے ادب اور ملک کی بڑی خدمت

کی ہے اگرچہ اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کچھ غلطیاں بھی ضرور سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن جو لوگ صرف اُس کی خامیاں ہی گنتے ہیں۔ میں اُن سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"لیکن یہ تو آپ مانتے ہیں کہ اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔"

"جی ہاں۔ منظم صورت اب باقی نہیں ہے۔"

" اور کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک محض چند افراد سے حصولِ شہرت اور باہمی ستائش کی تحریک تھی، اِس سے اُنھوں نے اپنا اُتو سیدھا کیا اور پھر تحریک کا " بولورام" ہو گیا۔ اِس کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟

"ع لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے"

مجھے توقع تھی کہ میری بات کے جواب میں ساحر اپنا یہ مصرعہ پڑھ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اُنھوں نے خلافِ توقع بہت تحمّل سے کہنا شروع کیا۔

" نہیں ایسی بات نہیں ہے، اِس تحریک کے افراد نے کافی قربانیاں دی ہیں، صعوبتیں جھیلی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک دوسرے کی شہرت میں اضافہ کا باعث ہوئے ہیں۔ اُس کی وجہ سماج اور ادب کے منفی میلانات کے خلاف اُن کی نظریاتی یکسانی تھی، اب اگر تحریک میں کرائسس پیدا ہوا تو اِس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں سرمایہ داری کے توڑ کے لئے اشتراکی نظام کا جو خوش آئند تصور تھا، اُس میں بھی شخصی آزادی اور کچھ دوسرے معاملات کے متعلق بعض عملی خرابیاں محسوس ہوئیں۔"

میں نے موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔

"فلمی شاعری، اور خاص طور پر اپنی فلمی شاعری سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ادبی شاعری کیلئے بھی شروع میں روایتی شاعری کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے دل پسند اسٹائل سے کام لیتا ہے۔ میں نے بھی ابتدا میں فلمی دُنیا کی روایت سے ملتی جلتی شاعری کی اور بعد میں اپنی جگہ بنانے پر میں اس قابل ہوا کہ بہت سی فلموں میں اپنی پسند کی فلمیں انتخاب کر سکوں۔ اس طرح میں بہ آسانی اور بخوبی اپنے خیالات و جذبات کا پرچار کر سکا۔" اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ساحر نے کہا ــــــ

"فلم کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے خیالات و جذبات کا پرچار کرنے کیلئے یہ ایک پاورفُل میڈیم ہے۔"

"یہ بتلایئے کہ پُرانے فلمی شاعروں میں کونسا شاعر آپ کو پسند ہے؟"

"آرزو لکھنوی۔"

"اور ہم عصر فلمی شاعروں میں؟"

ساحر کے بھرے ہوئے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کا رنگ دوڑا۔ لیکن جلد ہی اُنہوں نے متوازن ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا صدر رہوں اسلئے اس سوال کا جواب دینا میرے لئے مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اب سب فلمی شاعروں کو ایک آنکھ سے دیکھنا میرا فرض ہے۔"

دفعتاً مجھے ساحر کی کسی پُرانی نظم کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کر دو   ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

"اِس کا جواب دینا تو غالباً آپ نامناسب خیال نہیں کریں گے۔"

میں نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

ساحر جیسے اِس غیر متوقع سوال کو سُن کر چونک سے گئے اور پھر حسبِ عادت اِس سوال کو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "کیونکہ کچھ لڑکیاں مجھ تک دیر سے پہنچیں۔ اور کچھ لڑکیوں تک میں دیر سے پہنچا۔"

مشترکہ قہقہے کے بعد میں نے کہا۔۔۔ "اچھا ساحر صاحب! مجھے اب اجازت دیجیے۔ کیونکہ میں بمبئی میں اپنی قیام گاہ پر بر وقت پہنچنا چاہتا ہوں۔"

تاج محل

تاج تیرے لئے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اِس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے!
بزمِ شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اُس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

میری محبوب! پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اَن گنت لوگوں نے دُنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُنکے
لیکن اُن کیلئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مُفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے جن میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اِسے شکلِ جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

نورجہاں کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں یہ دُخترِ جمہور کی قبر
کتنے گُم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اُٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لئے
سُرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے مُنہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مُرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِّ سُبحان کی اُلفت کے بھرم کی خاطر

کیسے اِک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جُنبش!
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لُوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ماتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے، فریاد کناں ہو جیسے
سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیسِ وفا، مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

جاگیر

پھر اُسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طربگاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیش کے لئے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم، حسیں باہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دُبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم، دلآویز، اُبلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری، نکہتِ گیسو بھی مری

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
اُن کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ سنیں
اُن کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
اُن کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں، نہ تنیں

ہلے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں اِن آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں اِدھر کون چلی آتی ہے
بڑھ کے اُس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

خون پھر خون ہے

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے، تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا
خاکِ صحرا پہ جمے، یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھُپ چھُپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلّادوں کے مسکن کا سُراغ
سازشیں لاکھ اُڑھاتی رہیں ظلمت کی نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمتِ ناکارہ و رُسوا سے کہو
جبر کی حکمتِ پُرکار کے ایما سے کہو

محمل مجلسِ اقوام کی لیلےٰ سے کہو
خون دیوانہ ہے، دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تُند ہے خرمن پہ لپک سکتا ہے

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچۂ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ، کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رُکتا نہیں سنگینوں سے
سر اُٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے، آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

ایک تصویرِ رنگ

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حُسن کا نغمۂ جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبۂ بے تاب نظر آئی تھی

اے طربِ زارِ جوانی کی پریشاں تتلی
تو بھی اِک بوئے گرفتار ہے، معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے، معلوم نہ تھا

تیرے نازک سے پروں پر یہ زر و سیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
تو نے راحت کی تمنا میں جو غم پالا ہے
وہ تری روح کو آباد نہ ہونے دے گا

تو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کیلئے
اپنے دل، اپنی محبت کا لہو بیچا ہے
دن کی تزئینِ فسردہ کا اثاثہ لے کر
شوخ راتوں کی مسرت کا لہو بیچا ہے

زخم خوردہ ہیں تخیل کی اُڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری روح کے غم پلتے ہیں
سُرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لَو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیئے جلتے ہیں

اِس سے کیا فائدہ، رنگین لبادوں کے تلے
روح جلتی رہے، گھلتی رہے، پژمردہ رہے
ہونٹ ہنستے ہوں دکھاوے کے تبسم کیلئے
دل غمِ زیست سے بوجھل رہے افسردہ رہے

دل کی تسکیں بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے، درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری روح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دیدے
ایک لمحہ جو تری لے میں مسرت بھر دے

غزلیں

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم
کچھ اور بڑھ گئے، جو اندھیرا ہوا تو کیا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

لے دے کے اپنے پاس یہی اِک نظر تو ہے
کیا دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم ،
مانا کہ اِس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم ہی کر گئے گزرے جدھر سے ہم
دے گا کسی مقام پہ خود راہزن کا ساتھ
اتنے بھی بدگمان نہ تھے راہبر سے ہم

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے
جگمگاتے ہیں اُفق پار ستارے، لیکن
راستہ منزلِ ہستی کا مہیب آج بھی ہے
اہلِ دانش نے جسے امرِ مسلّم جانا
اہلِ دل کیلئے وہ بات عجیب آج بھی ہے
یہ تری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگِ جاں کے قریب آج بھی ہے
کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

قتیل شفائی

قتیل کے آرٹ کی عمارت حسن، نغمہ اور آہنگ
کی بنیادوں پر استوار ہے، اُن کی شاعری میں اسلوب
کی نغمگی اور لچک سے صحتمند عناصر اپنی تمام تر
جمالیاتی آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے ہیں اور کہیں کہیں
تو موضوع کی شدت اور خیال کی ندرت بھی اِس
جگمگاہٹ میں ماند پڑ جاتی ہے اُن کی مقبولیت کا
راز اُن کے لب و لہجہ کی شیریں اور گہری رومانیت
میں مضمر ہے، اِس رومانیت کا اکتساب اُنہوں نے
اگرچہ احمد ندیم قاسمی کے اثرات سے کیا ہے۔
لیکن اپنے انفرادی تجربوں اور ذاتی کاوشوں کی
رنگ آمیزی سے ان اثرات کو نیا حسن اور نئی
زندگی عطا کی ہے۔

شاد: اے بلبلِ باغِ خوش نوائی ۔ محترم بھائی، قتیل شفائی! آداب عرض کرتا ہوں۔

قتیل: آہا، جنابِ شاد ہیں ۔ تشریف لائیے۔ کہئے اچھے تو ہیں آپ ؟

شاد: شاد ہو کر ملول ہیں ہم لوگ
کیا خلافِ اصول ہیں ہم لوگ

قتیل: غالباً اپنی بے اعتدالیوں بلکہ بداعتدالیوں کی وجہ سے شادؔ صاحب آپ کے بارے میں ہمیشہ کچھ پریشان کن خبریں سُنتا رہتا ہوں اور سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاؤں ۔ خدا کیلئے اپنے آپ پر رحم کیجئے ۔ اب تو عدم جیسا بلا نوش بھی تائب ہو چکا ہے ۔

شاد: خدا کیلئے تو نہیں، محض اپنے لئے پچھلے دو مہینوں سے اپنے آپ پر رحم کر رہا ہوں ۔ اگر "رحمدل" دوستوں سے محفوظ رہا تو شائد میں بھی عدم صاحب کی پیروی کر لوں ۔ لیکن ایک بات بتایئے قتیلؔ صاحب! کہ شاعر کی زندگی میں شراب اور عورت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور اگر ہے تو کیوں ؟"

قتیل: میری نزدیک شاعر کی زندگی میں شراب کو کوئی اہمیت

حاصل نہیں۔ میں نے اختر شیرانی، منٹو اور عدم کی زندگیوں کا
بغور مطالعہ کیا ہے، یہ تینوں حضرات نشے کے عالم میں اوّل تو
کچھ لکھ ہی نہیں پائے، اور اگر مشاقی کے زور پر کچھ لکھ بھی لیا
تو وہ اُن تحریروں سے کمتر نکلا جو عالمِ ہوش کی پیداوار تھیں۔
شراب نوشی ایک ذاتی فعل ہے۔ اسے شعر و ادب سے وابستہ
کر دینا بڑی زیادتی ہے۔ رہا حُسن کا معاملہ تو آپ اِسے بھی ذرا
وسیع مفہوم دیدیجیے تو میں اقرار کر لوں گا کہ شاعر سے بڑا حُسن کا
پرستار کوئی نہیں۔

شاد: حُسن کے تو برادرم! آپ دیرینہ و مستند پرستار ہیں۔ مجھے ذاتی
طور پر بھی کم سے کم آپ کے ایک اہم معاشقے کا بخوبی علم ہے۔ یہ
بتائیے کہ اِس معاشقے نے آپ کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔

قتیل: میرے بارے میں جو کچھ آپ کو معلوم ہے وہ مکمل نہیں۔ بات اِس
سے آگے بڑھ چکی ہے۔ بہرحال زندگی کا ہر تجربہ کچھ نہ کچھ ساتھ
لاتا ہے اور میری شاعری نے بھی اِن تجربوں سے بہت کچھ حاصل
کیا ہے۔

شاد: تجربہ تو آپ نے فلمی دُنیا میں جانے کا بھی کیا ہے جو خاصہ
کامیاب رہا ہے۔ یہ فرمائیے کہ اِس تجربے سے آپ کی شاعری
کس حد تک اثر پذیر ہوئی؟

قتیل: یعنی فلمی دُنیا میں شمولیت نے میری شاعری پر کیا اثر ڈالا — !
بات یہ ہے کہ جن کو ڈوبنا ہو وہ سفینوں میں بھی ڈوب جاتے ہیں۔
یہ ضروری نہیں کہ فلم سے وابستہ ہو کر ایک شاعر اپنی تخلیقی خوبیوں

سے محروم ہو جائے۔ آپ نے ایسے لوگ بھی تو دیکھے ہوں گے
جنہوں نے نگار خانوں کی شکل تک نہیں دیکھی، اس کے باوجود بانجھ
ہو کر رہ گئے۔ دراصل یہ مسئلہ شعر سے لگن کا ہے حصولِ زر کا نہیں۔

شاد: آپ اس حقیقت کو مانتے ہیں نا، کہ تخلیقِ شعر سے شاعر کو
یک گونہ ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے؟

قتیل: شعر کی تخلیق کا معاملہ بالکل ویسا ہی ہے شاد صاحب! جیسے
بچے کی تخلیق کا۔ جس طرح ایک ماں تخلیق کا عمل پورا کرنے کے بعد
ایک ٹھنڈک اور ایک سکون محسوس کرتی ہے۔ یقیناً شاعر بھی تخلیقِ شعر
کے بعد بے پایاں سرشاری سے ہم آغوش نظر آتا ہے۔ یہ الگ
بات ہے کہ بعض شعراء اِن ماؤں کی تقلید کرنے لگتے ہیں جو فیملی
پلاننگ سے بے نیاز ایک کے بعد ایک بچہ جنتے جنتے اُس
کیف کو کم کرتی چلی جاتی ہیں جو انتظار سے عبارت ہوتا ہے۔ پھر
بھی ذہنی سکون کے کچھ پہلو نکل ہی آتے ہیں۔ کیونکہ اولاد آخر
اولاد ہی ہوتی ہے۔

شاد: اور آپ اپنی اولاد جنتے کیونکر ہیں؟ معاف کیجئے میرا مطلب ہے
یعنی شعر کیسے کہتے ہیں؟

قتیل: شعر کہنے کا میرا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے۔ جب اور جس وقت
بھی دماغ پر خیالات کی ترشح ہونے لگتی ہے قلم کاغذ سنبھال کر
بیٹھ جاتا ہوں۔ لیکن رات کے سناٹے میں شعر کہنے کا جو مزا ہے
وہ کسی اور وقت نہیں آتا۔ گھر کے سب لوگ سو رہے ہوں اور میں
اپنی فکر میں ڈوبا ہوا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہوں تو ایک عجیب سی

کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن میری بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ برسوں کی مشاقی
کے باوجود اُس وقت یہ کیفیت بالکل ختم ہو جاتی ہے، جب
میرے سگریٹ ختم ہو جائیں اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ شعروں کی
تخلیق میری سوچ سے ہوتی ہے یا سگریٹوں کے دھوئیں سے۔
آہ! وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو سگریٹ کے بغیر
شعر کہہ لیتے ہیں۔

شاد: شعر کہنے کیلئے بالعموم آپ کو کیسا ماحول درکار ہوتا ہے؟

قتیل: جیسا بھی ماحول ہو مجھے منظور ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے
کہ مکمل سکوت ہو۔ سگریٹ افراط سے موجود ہوں اور اچھا قلم کاغذ
ہو تو تخلیقِ شعر کا مرحلہ حیرت انگیز طور پر بہت جلد طے ہو جاتا ہے۔

شاد: شروع شروع میں کِن شعراء سے آپ خاص طور پر
متاثر تھے؟

قتیل: اقبال۔ جوش۔ فراق۔ اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی اور ن۔م
راشد نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ لیکن میرے ابتدائی کلام پر
ندیم صاحب کی چھاپ بڑی گہری تھی۔ پھر جوں جوں مجھے زندگی
کے ذاتی تجربات کا سامنا ہوتا گیا، میری شاعری ایک الگ
سٹائل میں ڈھلتی گئی۔

شاد: حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی سے
آپ کی پہلی ملاقات کب اور کس طرح ہوئی؟

قتیل: حفیظ صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک ہی بار نہیں بلکہ
لاتعداد قسطوں میں اور غیر محدود عرصہ میں ہوئی۔ فیض صاحب

سے میں سب سے پہلے راولپنڈی میں ملا۔ جہاں اُنھوں نے میرے
ایک ایسے شعر پر داد دی جس کی پیروڈیاں سُن سُن کر میں بدحواس
ہو چکا تھا۔ اور ندیم صاحب سے تو میری پہلی ملاقات شاید کئی
جنم پہلے ہوئی ہو گی کیونکہ جب میں آج سے چوبیس برس پہلے
"پھول" کے دفتر میں اُن سے ملا تھا تو مجھے کسی نئے تعارف
کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ ہم آپس میں یوں ملے، جیسے پلکیں آپس
میں ملتی ہی رہتی ہیں۔

شاد: اپنے ابتدائی کلام پر تو ندیم صاحب سے غالباً آپ نے اصلاح
کبھی لی ہے نا؟

قتیل: بالکل ابتدائی شاعری پر اصلاح شفا خانپوری سے لی اور کچھ
آگے بڑھا تو ندیم صاحب نے رہنمائی کی۔

شاد: یہ بتایئے کہ آپ شاعری میں مقصدیت اور افادیت کے کس
حد تک قائل ہیں؟

قتیل: مقصدیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن ننگی نعرہ بازی
کا بھی میں قائل نہیں، جو بات کہنی ہو وہ اگر فن کی زبان سے کہی
جائے تو اثر بڑھ جاتا ہے۔ ویسے میرے نزدیک ایک ایسا
شعر جو محض ایک شعر ہے، لیکن پڑھنے والے کی روح کو چھو
لیتا ہے۔ مقصد اور افادیت سے خالی نہیں قرار دیا جا سکتا
یہ ضروری نہیں کہ کسی نظریے کی تبلیغ ہی سے شاعری میں
مقصدیت اور افادیت پیدا ہو۔ بلکہ انسانی زندگی کا ایک
تار بھی چھیڑ دے تو میں اُس شعر کو بے مقصد

یا غیر مفید تسلیم نہیں کروں گا۔

شاد: اچھا بھائی جان! یہ بتایئے کہ آپ کے ذہن میں اسلامی ادب کا کیا تصوّر ہے؟

قتیل: اس سوال کا مجھ سے کیا تعلق ہے شاد پیارے! کیا میری کسی تحریر کے پیشِ نظر آپ نے یہ پوچھنے کی زحمت کی ہے؟

شاد: نہیں قتیل بھائی! بالکل نہیں۔ اچھا یہ فرمایئے کہ آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟

قتیل: میں عملی طور پر سیاست سے وابستہ نہیں ہوں اور نہ میں اپنے آپ کو عملی سیاست کا اہل ہی پاتا ہوں۔

شاد: لیکن اگر آپ کو مجبور کر دیا جائے کہ آپ ضرور کسی سیاسی گروہ کا ساتھ دیں تو؟

قتیل: تو میں کسی ایسی جماعت کا انتخاب کروں گا جو فرقہ بندی اور سماجی اونچ نیچ کی مخالف ہو۔ جسے غریب کو زیادہ غریب اور امیر کو زیادہ امیر بنانا پسند نہ ہو، اور سب سے اہم بات یہ کہ اُسے ادب اور ادیب کی آزادی کا احترام کرنا آتا ہو۔

شاد: اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

قتیل: ترقی پسند ادب کی تحریک نے ہم میں سے بیشتر کو سوچ کی ایک نئی ڈگر پر ڈالا ہے اور وہ لوگ جو کل تک اِس تحریک کے طریقِ کار کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے، آج اِس تحریک کی تقلید میں اپنی اپنی تحریکوں کا کاروبار چلا رہے ہیں۔ اور میں حیران ہوں کہ نعرہ بازی کا جو انداز کل تک

نشانۂ ملامت بنایا جاتا تھا آج قابلِ تقلید کیسے ہوگیا؟

شاد : کیا موجودہ غزل کے معیار سے آپ مطمئن ہیں؟

قتیل : موجودہ غزل سے آپ کی مُراد کیا ہے؟

شاد : ظاہر ہے کہ جیسی غزل آج کل کہی جارہی ہے۔

قتیل : بھئی آج کل غزل تو فراق فیض اور ندیم بھی کہہ رہے ہیں اور "سویرا" اور "نصرت" میں بھی غزل کے نام سے بہت کچھ شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ کے پیشِ نظر آخرالذکر قسم کی غزل ہے تو میں واضح طور پر اپنے آپ کو اُس کے معیار کا منکر قرار دیتا ہوں۔

شاد : کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور کیا عروض سے واقفیت شاعر کے لئے ناگزیر خیال کرتے ہیں؟

قتیل : میں نے ابتدائے شاعری میں عروض پڑھا تھا اور سیکھا تھا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ چیز تو اُن لوگوں کے لئے کارآمد ہے جو موزوں طبع نہیں ہوتے۔ وہ شاعر ہی کیا جو ترازو کے بغیر شعر موزوں نہ کرسکے۔ بقولِ کسے ع

طبعِ موزوں را عروض و قافیہ درکار نیست

ہاں اُستاد بن کر شاگردوں کی قطار سجانا مقصود ہو تو عروض کو ناگزیر بھی خیال کیا جاسکتا ہے۔

شاد : شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف سے آپ کو کس حد تک دلچسپی ہے؟

قتیل : کبھی افسانے بھی لکھتا تھا۔ لیکن ہر شخص احمد ندیم قاسمی نہیں بن سکتا۔ اِس لئے صرف شاعری پر ہی قناعت

کرلی۔

شاد: بہت اچھا کیا۔ اچھا یہ بتائیے، آپ اِس صدی کا سب سے بڑا اُردو شاعر کسے تسلیم کرتے ہیں؟

قتیل: اقبال کو۔

شاد: اور اپنے ہم عصر شاعروں میں کون کون سے شاعر آپ کو پسند ہیں؟

قتیل: میری پسند بڑی عجیب و غریب ہے شاد بھائی! اگر میں نے اس کا اظہار کر دیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بہت سے قریبی دوست مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ اِس لئے اگر آپ مجھے اِس سوال کی قید سے آزاد ہی کر دیں تو اچھا ہے۔

شاد: بہتر صاحب۔ یہ فرمائیے کہ کیا اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

قتیل: اگر اچھا شاعر اچھا انسان بھی ثابت ہو تو کیا بات ہے۔ لیکن میں نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں، جنہیں اپنے بیوی بچّوں تک کا خیال نہیں۔ لیکن شعر واقعی اچھا کہہ لیتے ہیں، بلکہ معاشرے کی اصلاح اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے دعوے دار بھی بنے بیٹھے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اِس کا فیصلہ کوئی ماہرِ نفسیات ہی کر سکتا ہے۔

شاد: یعنی بندر کی بلا طویلے کے سر۔ اچھا قتیل صاحب! اِس گفتگو کو باقاعدہ انٹرویو کی شکل دینے کے لئے اب ایک دو بِکے بند سوال کرنا چاہوں گا۔ پہلے تو یہ بتائیے کہ

آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ اور تعلیم کہاں سے کہاں تک حاصل کی ؟

قتیل : ۲۴؍دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہری پور ہزارہ (سرحد) میں پیدا ہوا۔ اور ہری پور ہزارہ اور راولپنڈی میں بہت کوشش کی کہ کم از کم میٹرک کر لوں۔ مگر ناکام رہا۔

شاد : شاعری کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا ؟

قتیل : گورنمنٹ ہائی اسکول ہری پور ہزارہ کی بزم ادب کے خالق اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد اشرف ۱۹۳۵ء میں اتفاق سے ہمارے ہی مکان کے کرایہ دار تھے اور جانتے تھے کہ میں کچھ انٹ شنٹ قسم کے شعر بھی کہتا ہوں۔ اور افسانہ قسم کی کوئی چیز بھی میری تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔ خدا جانے اُنہیں کیا سوجھی کہ مجھے آئے دن طعنے دینے لگے کہ تم ہزار کوشش کرو، نہ تو شاعر بن سکتے ہو اور نہ نثر نگار، اور جیسا کہ میرے احباب جانتے ہیں، چیلنج تو میں فوراً قبول کر لیتا ہوں، چنانچہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں نے "بزم ادب" کے ایک مقابلہ میں خواجہ صاحب ہی کے ہاتھ سے اپنی کامیاب نظم پر ایک شعری مجموعہ "سوزِ بیدل" انعام میں حاصل کیا اور اُن کی طعن آمیز شفقتوں کی بدولت مجھے مستقبل کا ایک راستہ مل گیا۔ ویسے ابتدا میں ادب کا ذوق میرے والد نے بھی مجھ تک پہنچایا۔ وہ اس زمانے کی مقبول تصانیف مجھ سے پڑھوا کر سننے کے بہانے میری ادبی تربیت کرتے رہے یہ

زمانہ تھا جب ہمارے ہاں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ جب میرے دوستوں کو جیب خرچ کیلئے آنہ یا دو پیسے یومیہ ملا کرتے تھے۔ لیکن مجھے گھر سے ایک روپیہ روزانہ سے کم نہ ملتا تھا اور یہ رقم احباب کی تواضع کے علاوہ رسائل کی خریداری کے اوپر خرچ ہوتی تھی یا پنسل کاغذ پر۔ مطالعہ اور مشقِ سخن کیلئے جتنی سہولتیں ضروری تھیں وہ مجھے میسّر تھیں اور میں اپنے فطری ذوق کی پرورش کرتا چلا گیا۔

شاد: آپ کا سب سے پہلا شعر کیا تھا؟

قتیل: یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ میرا سب سے پہلا شعر کونسا تھا۔ البتہ ابتدائی شاعری میں میرا جو شعر میرے ساتھیوں کی پسند کے باعث مجھے یاد رہ گیا وہ یہ ہے ؎

کبھی پھول بنے اور مسکائے کبھی شعلہ بن کے رودئے ہیں
اِس گلشنِ ہستی میں لے دل، یوں ہم نے عمر گذاری ہے

اور پوچھئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟

شاد: کیوں، اُکتا گئے آپ! غالباً مشاعرے کا وقت ہو رہا ہے کیوں، یہی بات ہے نا؟ اگر یہ بات ہے تو آخر میں صرف یہی بتائیے کہ کیا موجودہ مشاعروں کو آپ اُردو کی ترویج و اشاعت کیلئے سود مند خیال کرتے ہیں۔

قتیل: بہت حد تک۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مشاعروں کے معیار کا خیال رکھا جائے۔

شاد: آپ کے خیال میں مشاعروں کے معیار کا خیال کیوں کر رکھا

جاسکتا ہے؟

قتیل: اِس طرح کہ اچھے شاعر مدعو کئے جائیں۔ بلکہ سُننے والے بھی صاحبِ ذوق ہوں۔ سفارشی شاعر اور سرکاری سامعین مشاعرے کے دشمن ہیں۔

شاد: بہت اچھا قتیل صاحب! میں اب بادلِ ناخواستہ آپ کو اِن دُشمنوں کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ ان کے مشاعرے میں جایئے اور مجھے اجازت دیجیے۔ خدا حافظ!

★

تماشہ بین

آج تک میں نے تجھے دیکھا نہیں، لیکن یہ کیا
جب بھی چاہوں، جس طرح چاہوں، جہاں بھی چاہوں میں
تیرے خد و خال، تیری چال، تیری گفتگو
دیکھ سکتا ہوں، بتا سکتا ہوں سُن سکتا ہوں میں

تیرا جیتا جاگتا سایہ ہے میرے سامنے

یہ ترا سایہ، یہ تیرے جسم کی گمنام بھول!
جب کبھی میں نے اسے دیکھا، تری یاد آ گئی
اور جب اس یاد کی چلمن سے دیکھا جھانک کر
میری آنکھوں میں وہ تیری زندگی لہرا گئی

وقت جس کو کھینچ کر لایا ہے میرے سامنے

دیکھ میرے سامنے ہے وہ ترا جرم نہاں
جو عیاں کرتا رہے گا تیرے خدّ و خال کو
تو چھپا سکتا نہیں اب اپنے چہرے کے نقوش
مل گیا اک جسم، اک پیکر ترے اعمال کو

اک نئے پیکر میں تو آیا ہے میرے سامنے

دیکھتا ہوں میں تجھے اِس بچپنے کی شکل میں
جو کسی کی بھی نظر میں پیار کے قابل نہیں
بھول بیٹھا ہے جسے تو اپنے ماضی کی طرح
اِس بھری دُنیا میں جس کا کوئی مستقبل نہیں

تیری خوش ذوقی کا سرمایا ہے میرے سامنے

تیری خوش ذوقی کا سرمایا یہ اِک نورس کلی
کمسنی میں بھی ہے اِس پر کتنے بھونروں کی نظر
جس طرح تو نے خریدا تھا کسی کے جسم کو
دے گا بولی اِس کی بھی اِک روز کوئی اہلِ زر

ایک بادل دور تک چھایا ہے میرے سامنے

کسبی

حریمِ طرب کی پُراسرار چلمن، سرِ شام جب بھی اُٹھائی گئی ہے
دہکتے لبوں کی گلابی چتا پر کسی گیت کی لاش پائی گئی ہے
تھرکتے بدن کے حسیں زاویے جب کبھی ایک محراب میں ڈھل گئے ہیں
جوانی کے معبد میں بے آبرو حسرتوں کے ہزاروں دیے جل گئے ہیں
حسیں عارضوں کے تنک تاب شعلے سیہ فام زلفوں سے چھنتے رہے ہیں
سمن پوش رانوں کے مجبور منظر نگاہوں کی خوراک بنتے رہے ہیں

کھنکتی فضاؤں کا ایک ایک لمحہ چھناکوں میں چھپ چھپ کے رو رہا ہے
رفیقانِ شب کا معطر پسینہ ندامت کے داغوں کو دھو رہا ہے
جوانی کی دیوی محبت کے مرگھٹ میں اپنے ہی پھولوں سے کھیلی ہے کیا کیا
زر و سیم کی مسکراتی اذیت، لٹی آرزوؤں نے جھیلی ہے کیا کیا
پسِ پردہ حسن روتی جوانی، ہمیشہ تڑپنے پہ مائل رہی ہے
مگر جسم کی تاجرانہ مروت ارادوں کے رستے میں حائل رہی ہے
بلاتی رہی ہے خیالوں کی ڈولی سے اکثر کہاروں کو سونے سے پہلے
سُنا ہے کہ یہ جنسِ بازار، عورت تھی، نیلام ہونے سے پہلے

یہ حدیں یہ فاصلے

دیدۂ حیرت سے مجھ کو دیکھتی ہیں آج کل
تیرے کوچے کی پرانی رہنے والی لڑکیاں
سر جھکائے جب گذرتا ہوں ترے کوچے سے میں
چلمنوں کو نوچتی ہیں یہ نرالی لڑکیاں
ڈوب سی جاتی ہیں ماضی کے سنہرے خواب میں
گوری گوری، پیلی پیلی، کالی کالی لڑکیاں

میں کہ تیری محفلوں سے کل تلک سرشار تھا
آج تیری جلوتوں سے بھی سراسر دور ہوں
ایک نغمہ تھی تجھے کل تک مرے قدموں کی چاپ
آج تیرے لب پہ ہیں اک حرفِ نامشکور ہوں
یہ نگاہوں کی حدیں، یہ دھڑکنوں کے فاصلے
تجھ سے اپنا حالِ دل کہنے سے بھی معذور ہوں

زندگی کے بے وفا رنگوں کی یہ قوسِ قزح
ایک ہی حدِ نظر پر کیوں تنی بھی رہتی نہیں
آرزوؤں کی زباں میں پیار کہتے ہیں جسے
کیوں سدا اس پیڑ کی چھاؤں گھنی رہتی نہیں
کیوں تلوّن کے لٹیرے لوٹ لیتے ہیں انہیں
رہروؤں میں تا بہ منزل کیوں بنی رہتی نہیں

کیوں نہیں اُٹھتی ہے اب میری نظر تیری طرف
سوچتی ہوں گی دلوں میں بھولی بھالی لڑکیاں
کون سمجھائے انہیں ترکِ محبت کا سبب
ہائے یہ کم فہم، یہ نازوں کی پالی لڑکیاں
دیدۂ حیرت سے مجھ کو دیکھتی ہیں آج کل
تیرے کوچے کی پرانی رہنے والی لڑکیاں

غزلیں

کوئی مقامِ سکوں راستے میں آیا نہیں
ہزار پیڑ ہیں، لیکن کہیں بھی سایا نہیں
کسے پکارے کوئی آہٹوں کے صحرا میں
یہاں کبھی کوئی چہرا نظر تو آیا نہیں
بھٹک رہے ہیں ابھی تک مسافرانِ وصال
ترے جمال نے کوئی دیا جلایا نہیں
تمام نغمگیٔ مے تمہارے دم سے تھی
تمہارے بعد کوئی جام کھنکھنایا نہیں
یہ اور بات ہے اِن آنکھوں کا ہو اثر ورنہ
بنا تغیر کبھی کوئی لڑکھڑایا نہیں
ترس گئی ہے زمیں بادلوں کی صورت کو
کسی ندی نے کوئی گیت گنگنایا نہیں
اُجڑ گیا ہے کسی زلزلے میں شہرِ وفا
نہ جانے پھر اسے ہم نے بھی کیوں بسایا نہیں
قتیلؔ کیسے کٹے گی یہ دوپہر غم کی
مرے نصیب میں اِن گیسوؤں کا سایا نہیں

چراغ ٹمٹما رہے ہیں ظلمتوں کی چھاؤں میں
کہ جیسے طائرِ قفس گھٹی گھٹی فضاؤں میں

دماغ و دل کے درمیاں رُکے رُکے سے ولولے
کہ جیسے بیڑیاں پڑی ہوں غازیوں کے پاؤں میں

نویدِ موسمِ بہار، گُل بہ گُل، چمن چمن!
کہ جیسے عاشقوں کا ذکر، دہ بھی گاؤں گاؤں میں

ترس ترس کے مر رہی ہیں دل ہی دل میں حسرتیں
کہ جیسے بیگماتِ سیم تن، حرم سراؤں میں

ہوائیں تپیوں کی بھینی بھینی سرسراہٹیں
کہ جیسے نوک جھونک ہو رہی ہو اپسراؤں میں

مٹھاس بن گئی ہیں یوں بھی زندگی کی تلخیاں
کہ جیسے کیفِ سرمدی شباب کی خطاؤں میں

گرمیٔ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

بچ نکلتے ہیں اگر آتشِ سیّال سے ہم
شعلۂ آتشِ گلفام سے جل جاتے ہیں

خودنمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لئے
ہم اُسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

ربطِ باہم پہ ہمیں کیا نہ کہیں گے دشمن
آشنا جب ترے پیغام سے جل جاتے ہیں

اشعار

بنامِ ساقیٔ دیر و حرم ملے ہیں سراب
اب ایک دَور ہمارا بھی نام لے کے چلے

یوں کسی کا پیارا آغوشِ ہوس میں کھو گیا
کوئی لاشہ جس طرح لپٹا ہوا کمخواب میں

ہم ڈوب گئے جاگتی راتوں کے بھنور میں
ہاتھ اُس کا ہمارے لئے پتوار ہی کب تھا

روز آتا ہے ستانے دوستی کے نام پر
کاش مجھ سا روگ لگ جائے مرے غمخوار کو

ہمیں تو موسمِ گُل نے بھی کر دیا رُسوا
سُنا ہے لوگ سلامت خزاں میں رہتے ہیں

جب بھی ہم بھٹکتے ہیں یاد کے اندھیرے میں
دفعتاً بدن ترا جگمگانے لگتا ہے

دیکھ مری انمول شرافت لُٹ بھی گیا شرمندہ بھی ہوں!
جیت بھی لی اخلاص کی بازی، ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

مری مفلسی سے بچ کر کہیں اور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں

جس نے دیکھا تری رفتار کا چلتا جادو
اُس کو آیا ہے بہکنے کا قرینہ کیا کیا

یہ بھی اِک طرفہ کرامت ہے ارے ملّاحو!
تم کنارا جسے کہہ دو، وہی منجدھار بنے

جانے تیری سکھیوں نے تجھ سے کیا کہا ہوگا
ہم تو ہو گئے رسوا اپنے ہم نشینوں میں

دل جان کے واعظ نے جسے توڑ دیا ہے
آجائے مزا وہ بھی جو اللہ کا گھر ہو

تشکم نے دل کی حقیقت بھی کھول دی آخر
مقام رزق سے آگے کوئی مقام نہیں

شکیل بدایونی

شکیل بدایونی نے اگرچہ غزل کے علاوہ دوسری
اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اُنکی
شاعرانہ انفرادیت کا انکشاف اُن کی غزلوں ہی
سے ہوتا ہے اور غزل ہی کے پردے میں اُن کے مذاقِ
سلیم اور طبیعِ رسا کی جھلکیاں پوری آب و تاب کے
ساتھ اپنا جادو جگاتی ہیں۔ غزل کی فنّی روایتوں
کا اُنہیں پورا احترام ہے، اِسی لئے وہ زبان کے
رکھ رکھاؤ، الفاظ کی نشست و برخاست اور
مصرعوں کی تراش خراش کا خاص خیال رکھتے ہیں
زبان و بیاں کے اِن محاسن کے علاوہ اُن کے بیشتر
غزلیہ اشعار کے سینے میں عصرِ حاضر کے ایک جوان
اور محبّت بھرے دل کی دھڑکنیں بھی واضح طور
پر سُنائی دیتی ہیں۔ مجموعی طور پر اُن کی غزلیہ
شاعری، قدیم و جدید رجحانات، کلاسیکی اور
رومانی میلانات اور شگفتگی اور پختگی کا ایک
دلکش سنگم ہے۔

شاد: آپ کا جنم کب اور کہاں ہوا؟ اور آپ نے تعلیم کہاں کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی؟

شکیل: میں ۳؍اگست ۱۹۱۶ء بروز جمعرات بدایوں (یو.پی) میں پیدا ہوا۔ اُردو، فارسی اور ہندی کی تعلیم بدایوں ہی میں مختلف اساتذہ سے حاصل کی، اور اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں سے ہائی اسکول کا امتحان ۱۹۳۶ء میں پاس کیا۔ اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

شاد: آپ کی شاعری کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا پہلا شعر کب اور کیا کہا؟

شکیل: میری شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اُس زمانے میں بدایوں جو علم و ادب کا گہوارہ ہے، کی گلی گلی میں شعر و سخن کے چرچے تھے اور میرے عم محترم مولانا ضیاء القادری کے ارد گرد شعراء و ادباء کا مجمع رہتا تھا۔ اِس ماحول میں رہ کر مجھے بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلی غزل کا صرف مقطع یاد رہ گیا ہے

بھلادو دل سے شکیلؔ اب جوابِ خط کا خیال
امیدِ واپسیٔ نامہ بر نہیں آتی

شاد: آپ نے اپنا تخلص شکیلؔ ہی کیوں تجویز کیا؟

شکیل: اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ایک ہی سال میں میں نے کئی تخلص رکھ کر بدلے، پہلے شکیلؔ، پھر صباؔ، پھر فروغؔ اور پھر یہ طے کیا کہ شکیلؔ ہی تخلص رکھا جائے۔ کیونکہ بہت کم ایسے نام ہوتے ہیں جن کو تخلص بنایا جا سکے اور میں نے اپنے نام میں تخلص والی بات پائی۔

شاد: شروع میں آپ نے اپنے کلام پر اصلاح کس سے لی؟

شکیلؔ: شروع میں اصلاح اپنے رشتے کے چچا حضرت ضیاء القادری سے لی، بعد میں تین چار غزلیں حضرت جگر مراد آبادی مرحوم کو بھی دکھائیں۔

شاد: آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟

شکیل: شعر کی تخلیق کیلئے مجھے تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے خیالوں میں ڈوب کر اپنے جذبات کی ادائیگی کے لئے پہلے کوئی حسین زمین اور ردیف قافیہ تلاش کرتا ہوں اس کے بعد جو کہنا چاہتا ہوں، شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہوں۔

شاد: خیر یہ تو آپ اچھا کرتے ہیں کہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ لیکن جناب! آپ نے یہ لفظ "ادائیگی" کیا کہا؟ غالباً آپ نے اسے اظہار کی بجائے استعمال کیا ہے؟

شکیل: جی ہاں، واقعی میں نے اسے اظہار کے معنی میں استعمال کیا ہے

اور یہ اِس لئے کہ میں بچپن ہی سے خیالات کی ادائیگی اور جذبات کی ادائیگی لکھتا اور کہتا چلا آیا ہوں، ایک صاحب کے دیوان پر میں نے مقدمہ لکھا تھا۔ اُس میں بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

شاد: لیکن گرائمر کے لحاظ سے یہ لفظ غلط ہے۔

شکیل: شاد بھائی! بات یہ ہے کہ میں نے کبھی گرائمر سے قربت حاصل نہیں کی۔ اِس لئے نثر نگاری کی طرف توجہ نہیں کی، البتہ نظم اور غزل میں جو الفاظ استعمال کرتا ہوں وہ نہایت ٹھوک بجا کے اور آزما کے۔ پھر بھی اِس سوچ میں ہوں کہ اِس لفظ میں ایسی کیا کشش ہے جو میری زبان پر آجاتا ہے۔

شاد: فی الحال یہ سوچنے کی بجائے یہ بتایئے کہ بہترین شعر کی آپ کے نزدیک کیا تعریف ہے؟

شکیل: میرے نزدیک بہترین شعر وہ ہے جسے کہہ کر شاعر خود لطف اندوز ہو اور جب وہ شعر کوئی دوسرا سُنے تو اُسکے دل کو چھو کر گزر جائے۔ ساتھ ہی ساتھ شعر میں کہی گئی بات منفرد ہو اور اگر بات منفرد نہ ہو تو اندازِ بیان ہی انوکھا ہو، سادہ الفاظ میں اگر بڑی بات کہہ دی جائے تو شعر کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے۔

شاد: کن کن ملکی اور غیر ملکی شاعروں سے آپ خاص خاص طور پر متاثر ہیں؟

شکیل: غیر ملکی شاعروں میں مجھے انگریزی ادب میں براؤننگ کیٹس، اور شیلے بیحد پسند ہیں۔ فارسی میں حافظ اور سعدی اور ملکی شاعروں میں ہندی میں کبیر داس اور سور داس اور اُردو میں مومن، غالب اقبال، فانی اور جگر اور اصغر سے زیادہ متاثر

کیا ہے؟

شاد: جب آپ نے شعر گوئی کا آغاز کیا تھا، اُس وقت شاعری کا کیا مقصد آپ کے پیشِ نظر تھا؟

شکیل: اپنی شاعری کے دورِ آغاز میں شاعری کا کوئی مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں ابتدائی دور میں سبھی کی شاعری بے مقصد ہوتی ہے، کیوں کہ اُس وقت تک شعور بالغ نہیں ہوتا ہے۔

شاد: آپ فلمی دُنیا سے کب اور کیونکر وابستہ ہوئے اور اِس ماحول نے آپ کی شاعری پر کیا اثر ڈالا؟

شکیل: میں ۳ر جون ۱۹۴۶ء سے فلمی دُنیا میں شامل ہوا۔ مجھے ڈائرکٹر اے آر کاردار نے فلمی دُنیا میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ فلمی ماحول نے میری شاعری پر یہ اثر ڈالا کہ ذاتی طور پر تو شاعر تھا ہی، لیکن پیشے کے لحاظ سے بھی شاعر ہو گیا۔ اور اِس طرح میری مشقِ سخن اور بڑھ گئی۔ ساحر لدھیانوی کے بقول، شاعری علمی ہو یا فلمی، ہمیں تو یہ پرکھنا چاہیے کہ شاعر اچھا ہے یا بُرا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اِس ماحول نے میری شاعری پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔ اِس ماحول میں رہ کر میں نے جو غزلیں کہی ہیں اُن کو ادبی حلقوں نے کافی سراہا ہے۔ اور عوام نے بھی۔ کیوں کہ آسان الفاظ میں بڑی بات کہنے کا سلیقہ میں نے فلمی دُنیا ہی میں آکر سیکھا۔

شاد: اپنے ہم عصر فلمی شاعروں میں کون کون سے شاعر آپ کو

پسند ہیں؟

شکیل : فلمی شاعروں میں ساحر لدھیانوی اور راجندر کرشن کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

شاد : آپ کی اپنی نظر میں آپ کا بہترین فلمی گیت کون سا ہے۔

شکیل : میں اپنا بہترین گیت خود انتخاب نہیں کر سکتا۔

شاد : آپ اِس صدی کا سب سے بڑا اُردو شاعر کسے تسلیم کرتے ہیں؟

شکیل : شاعری کے مختلف میدان ہوتے ہیں اور شعراء کے نظریات بھی جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ اِس لئے کسی ایک شاعر کو اس صدی کا سب سے بڑا شاعر کہہ دینا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

شاد : کیا موجودہ غزل سے معیار سے آپ مطمئن ہیں؟

شکیل : موجودہ غزل کے معیار سے میں مطمئن ضرور ہوں۔ لیکن توازن کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ ایک حلقہ تو غزل کو بوسیدہ اور دقیانوسی روایات کی طرف کھینچ رہا ہے۔ دوسرا حلقہ غزل کو ایسا روپ دے رہا ہے کہ غزل کی صورت ہی بدلی جارہی ہے۔ اگر اِس صنف میں توازن برقرار رکھا جائے تو غزل سدا سہاگن رہ سکتی ہے۔

شاد : کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور کیا عروض کا جاننا شاعر کے لئے ناگزیر خیال کرتے ہیں؟

شکیل : میں عروض سے زیادہ واقف نہیں، مگر تھوڑا بہت ضرور واقف ہوں۔ انسان اگر فطری شاعر ہو تو خود بخود وہی راہیں اختیار کرلیتا

ہے جو علم العروض نے قائم کر رکھی ہیں۔ میں نے بہت سے شاعر ایسے دیکھے ہیں جو فن عروض کے جانے بغیر اُردو شاعری میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔

شاد: کیا آپ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری بیکاری کی پیداوار ہے؟

شکیل: جی نہیں، شاعری محض بیکاری کی پیداوار نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مشغلۂ شعر و سخن کے لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ وہ وقت شاعر اپنی دیگر مصروفیتوں سے نکالے یا بے کاری کے لمحے شاعری میں صرف کرے۔

شاد: آپ کی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو۔

شکیل: اس کا جواب میرا یہ شعر دے گا ؎

کچھ ایسی حقیقتیں ہیں، جنکو

پابندِ حجاب چاہتا ہوں

شاد: آپ کے خیال میں کیا ہر اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

شکیل: ایک اچھے شاعر کا اچھا انسان ہونا یقینی ہے۔

شاد: کیا ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے؟ اگر ہے تو اس کی وجہ؟

شکیل: جی ہاں، ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے۔ وہ اس لئے کہ سیاست کے اِس بحرانی دور میں وقت کے ساتھ شاعر بھی بہہ رہا ہے۔ روحانیت پہ مادیت غالب ہے۔ اخلاقی قدریں مفقود ہیں۔ خیالات کی روانی ٹھہری ہوئی ہے۔ ذہن کشمکشوں میں اُلجھے

ہوئے ہیں۔ اگر شاعر روحانیت کا سہارا لے کر بڑھتا رہے تو
ادب میں جمود پیدا نہ ہو۔

شاد: آپ کے نزدیک ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

شکیل: ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوری ملک میں اگر
اُردو، جو ہندوستان ہی کی زبان ہے کا مستقبل شاندار نہ ہو تو
حیرت ناک بات ہوگی۔ اُردو کے مستقبل کے لئے یہ ضروری ہے کہ
جنتا کی کوششیں اور حکومت کا تعاون شاملِ حال رہے۔ اُردو کا
مٹنا قومی یکجہتی کا مٹنا ہے اور قومی یکجہتی کا مٹنا حکومت اور عوام گوارا
نہیں کر سکتے۔

شاد: کیا آپ اِس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اُردو
کی بقا کے لئے صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو
اپنا لیا جائے؟

شکیل: اُردو کی بقا کیلئے فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط قائم
رکھنا ضروری ہیں۔ گاندھی جی بھی اِسی نظریہ کے حامی تھے۔

شاد: کیا موجودہ مشاعروں کو آپ اُردو کی ترویج و اشاعت کے
لئے سودمند خیال کرتے ہیں؟

شکیل: بے شک۔ اُردو کی ترویج و اشاعت کیلئے مشاعرے
بے حد سودمند ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مشاعروں کی شکل
بگڑتی جا رہی ہے۔ لیکن مشاعرے جس حال میں بھی ہوں اُردو
زبان کی اشاعت کے لئے مفید ہیں۔

شاد: شاعری سے علاوہ دیگر اصنافِ ادب سے آپ کو کس حد

کس دلچسپی ہے ؟

شکیل : شاعری کے علاوہ دیگر اصنافِ ادب میں مجھے مزاحیہ افسانوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔

شاد : کون کون سے مزاح نگار آپ کو خاص طور پر پسند ہیں۔

شکیل : پطرس۔ عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی اور مرحوم شوکت تھانوی کی تحریروں نے مجھے کافی متاثر کیا ہے۔

شاد : کیا ادب ادیب کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے ؟

شکیل : یقیناً ادب ادیب کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے بھی یہی بات کہی ہے۔ کلام اور صاحبِ کلام میں ایک روحانی مناسبت ہوتی ہے۔ اچھے آدمی سے ہمیشہ اچھی بات کی توقع ہوتی ہے۔

شاد : آپ کے خیال میں ہمارا نظریۂ ادب کیا ہونا چاہئے ؟

شکیل : انسانیت کی تبلیغ، محبت کا پیغام، سماج کی کمزوریوں کو دور کرنا۔ وطن سے پیار۔ اور اخلاق و روحانیت کی تعلیم۔

شاد : آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے ؟

شکیل، میرا سیاسی نظریہ حب الوطنی، ملک کی آزادی کو قائم رکھنے کا عزم اور امن اور محبت ہے۔ یہ نظریہ درحقیقت سیاسی نظریہ نہیں بلکہ میرا قومی نظریہ ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میں سیاست کی دنیا سے بہت دور ہوں۔ سیاست نام ہے جھوٹ کا۔ اور فن نام ہے سچائی کا۔ اس لئے میں جھوٹ پر سچائی کی بنیاد رکھنے کا مخالف

ہوں۔

شاد: آپ ادب میں افادیت اور مقصدیت کے کس حد تک قائل ہیں؟

شکیل: ادب براہِ راست عوام کے ذہنوں اور دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس لئے ادب میں افادیت اور مقصدیت کا وجود نہایت ضروری ہے۔ سیاست کے اِس ہنگامی دَور میں ہر حادثے سے انسانوں کے دل اور دماغ بدل جاتے ہیں۔ کوئی حادثہ کسی نیک انسان کو بُرا بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کوئی حادثہ انسان کے دل میں فرقہ واریت کی آگ بھڑکا دیتا ہے۔ کوئی حادثہ انسان کو خود غرض بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کوئی حادثہ انسان کو انسان کا لہو بہانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اِن تمام بُرائیوں کو روکنے کیلئے اور سماج کو پیار اور محبت کی روشنی عطا کرنے کے لئے ایک طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ طاقت ہے شاعر کی آواز۔ اگر شاعر کی آواز انسان کے دل میں شمع محبت جلا دے تو اُس سے بڑی افادیت اور مقصدیت کیا ہو سکتی ہے؟

شاد: ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

شکیل: ترقی پسند تحریک جس معاشرے کو بروئے کار لانا چاہتی ہے، میں اُس کا مخالف نہیں ہوں۔ لیکن میں ادب کو پروپیگنڈہ کی مشین بنانے کے سخت خلاف ہوں۔ ایسا ادب جس کی بنیاد سیاست پر رکھی گئی ہو، زندۂ جاوید نہیں کہلا سکتا۔ آج سے

کچھ سال پہلے ہمارے شعراء نے چو این لائی کی مدح سرائی میں جو نظمیں کہی تھیں، وہی نظمیں آج سب کی سب بیکار ہو گئی ہیں۔ غرض کہ سیاست کے ساتھ ادب بھی بدل جاتا ہے۔ اور جو ادب ناپائیدار ہو اُس کی قیمت وقتی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سیاست کے کروٹ لیتے ہی وہ ادب فنا ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب میں "گروپ اِزم" کی بنیاد ڈالی ہے جو ادب کیلئے سخت مضر ہے۔ شاعر کی ہستی ازموں میں اُلجھنے والی نہیں، بلکہ بلند و بالا ہے۔ شاعر کی آواز' خدا کی آواز ہے۔ شاعر کی دُنیا امن، محبّت اور روحانیت کی دُنیا ہے۔ شاعر کا یہ منصب نہیں ہے کہ کسی ایک ملک کے سیاسی نظریے میں اُلجھ کر رہ جائے، یا کسی ایک پلیٹ فارم پر خود کو محدود کر کے دوسرے مذاہب سے نفرت پیدا کرے۔ بلکہ سچا شاعر وہی ہے جو انسان کو انسانیت کا درس دے۔ اس کے برخلاف ترقی پسندی کے حامیوں نے خود کو ایک خاص تحریک تک محدود کر لیا ہے، اور وہ بھی ایسی تحریک جس کا تعلق سیاست دانوں سے زیادہ ہے اور شاعروں سے کم۔

شاد: کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟

شکیل: جی نہیں، شعر و شراب قطعاً لازم و ملزوم نہیں ہیں۔

شاد: ویسے کیا آپ شراب پیتے ہیں؟

شکیل: نہیں بھائی، میں نے کبھی شراب نہیں پی۔

شاد: تو پھر آپ رندانہ اشعار کیوں کہتے ہیں؟ کیا محض رسماً؟

شکیل: میں نے رندانہ اشعار ضرور کہے ہیں لیکن جس طرح محبت
کا نظریہ میرے نزدیک صرف SEX تک محدود نہیں ہے
اسی طرح شراب بھی عرق وانگور تک محدود نہیں۔ میرے یہاں
کیف دستی کا نظریہ لامحدود ہے۔ میرا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

سب کی ہے نگاہوں میں مُدامے کا تصور
میرا تو عقیدہ ہے کہ ہر شخص نے پی ہے

اِس کے علاوہ ہم سب جانتے ہیں کہ خمریات پر ایک مکمل اور
ضخیم دیوان حضرت ریاضؔ خیر آبادی نے تصنیف کیا ہے اور
اُنھوں نے شراب پر ایسے ایسے شعر کہے ہیں جو اُردو شاعری کا
گراں قدر سرمایہ ہیں۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ انھوں نے زندگی
بھر شراب کو منہ نہیں لگایا۔ میری دُعائیں آپ کے بھی ساتھ
ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ بھی ترکِ مے نوشی کر لیں۔ آپ کہیں گے
ناممکن ہے میں کہوں گا دُنیا میں ہر بات ممکن ہے بشرطیکہ انسان
کا عزم راسخ ہو۔ معاف کیجئے گا، مجھے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں
تھی لیکن آپ کو ایک بہت اچھا شاعر سمجھتا ہوں، اِس لئے
آپ کی زندگی سے بھی دلچسپی ہے۔ قوم کو بیدار کرنے والا شاعر
خود بھی تو بیدار ہو سکتا ہے۔ کیا آپ اِس سلسلے میں روشنی
ڈالیں گے؟

شاد: ضرور ڈالوں گا۔ مگر فی الحال نہیں۔

غزلیں

اِس درجہ بدگماں ہیں خلوصِ بشر سے ہم
اپنوں کو دیکھتے ہیں پرائی نظر سے ، ہم

وہ مل گئے تو اپنا ہی دھوکا ہوا ہمیں
آئینہ آج دیکھ کے نکلے تھے گھر سے ، ہم

غنچوں سے پیار کرکے یہ عزّت ملی ہمیں
چومے قدم بہار نے گذرے جدھر سے ، ہم

واللہ تجھ سے ترکِ تعلق کے بعد بھی
اکثر گزر گئے ہیں تری رہ گذر سے ، ہم

صدق و صفائے قلب سے محروم ہے حیات
کرتے ہیں بندگی بھی جہنم کے ڈر سے ، ہم

رہ رہ کے دیکھتے ہیں تمہیں کو خطا معاف
مجبور ہو گئے ہیں مذاقِ نظر سے ، ہم

عقبیٰ میں بھی ملے گی یہی زندگی شکیل
مرکر بھی چھوٹ نہ پائیں گے اِس دردِ سر سے ہم

بے خودی ہے نہ ہوشیاری ہے
بادہ خواری سی بادہ خواری ہے
حُسن مصروفِ پردہ داری ہے
جانے اب کس نظر کی باری ہے
کم نہیں شورشِ نفس، لیکن
زندگی پر جمود طاری ہے
غمِ اُلفت تو دل سے ہار چکا
اب غمِ زندگی کی باری ہے
جس چمن میں کبھی نہ آئے بہار
اُس چمن کی خزاں بھی پیاری ہے
ہائے وہ بادہ کش، کہ جس نے تشکیل
زندگی بے پیئے گزاری ہے

ذوقِ لطیف و چشمِ حقیقت نگر کہاں
حُسنِ ازل تو عام ہے، حُسنِ نظر کہاں
تیرے حضور وسعتِ قلب و نظر کہاں
جو تجھ میں کھو گیا اُسے اپنی خبر کہاں
غم روحِ زندگی ہے تو غم سے مفر کہاں
جائے گا زندگی سے کوئی روٹھ کر کہاں

بے مصلحت گذار نہ عالم شباب کا
اے وقت ناشناس! یہ دن عمر بھر کہاں
جلوے سما ہی جائیں گے آئے تو کوئے دوست
دامن سے بچ کے جائے گی گردِ سفر کہاں
زاہد کی برہمی کا اثر لیں نہ بادہ خوار
جذبات مشتعل ہوں تو فکر و نظر کہاں
ہر چند آندھیوں کی ہیں گلشن میں یورشیں
لیکن ابھی شکستِ نسیمِ سحر کہاں
مانا کہ حسن آہ سے ہوتا ہے بے قرار
لیکن کسی کی آہ میں اتنا اثر کہاں!
اِک روز تو میں ڈھونڈھ ہی لوں گا جہانِ نو
دُنیا مجھے تلاش کرے گی مگر کہاں
ہر لحظہ نا تمام ہے رودادِ غم شکیلؔ!
اہلِ نظر کو فرصتِ نقد و نظر کہاں

ضبط کا خوگر ہے دل، اُن کی توجہ کم سہی
زندگی میں غم ہیں لاکھوں، ایک یہ بھی غم سہی
غور سے سُن لیں مکینِ جنّتِ آسودگاں
گر بھی جاتے ہیں مکاں، بنیاد مستحکم سہی
آپ خونِ عشق کا الزام اپنے سر نہ لیں
آپ کا دامن سلامت اپنے قاتل ہم سہی

ہم نہیں اے ہم نشیں منت کشِ فصلِ بہار
ہم کو پینے سے ہے مطلب کوئی بھی موسم سہی
جن کو اُٹھنا ہے وہ اُٹھ جاتے ہیں محفل سے کبھی
بعد اُن کے بزم میں گریہ سہی ماتم سہی

دانستہ سامنے سے جو وہ بے خبر گئے
دل پر ہزار طرح کے عالم گزر گئے
خودداریٔ حیات کو بدنام کر گئے
پروانے کیوں نہ جلنے سے پہلے ہی مر گئے
ہم اس لئے مقامِ فنا سے گزر گئے
وہ یہ کہیں نہ کہہ دیں کہ مرنے سے ڈر گئے
آوارگانِ کوئے محبت جدھر گئے
دُنیا پکار اُٹھی کہ غلط راہ پر گئے
رودادِ اہلِ بزمِ محبت نہ پوچھئے
ہنستے ہوئے جو آئے تھے باچشمِ تر گئے
جب تجھ کو ارتباطِ محبت، یہ ناز تھا
اے زندگی! بتا وہ زمانے کدھر گئے؟

اُن سے اُمیدِ رہ نمائی ہے
کیا نگاہوں کی موت آئی ہے

حُسن مصروفِ خود نمائی ہے
عشق کا دورِ ابتدائی ہے

دل نے غم سے شکست کھائی ہے
عمرِ رفتہ تری دُہائی ہے

دل کی بربادیوں پہ نازاں ہوں
فتح پا کر شکست کھائی ہے

میرے معبد نہیں ہیں دیر و حرم
احتیاطاً جبیں جھکائی ہے

وہ ہوا دے رہے ہیں دامن سے
ہائے کس وقت نیند آئی ہے

کھُل گیا اُن کی آرزو میں یہ راز
زیست اپنی نہیں پرائی ہے

شمع و پروانہ ہوں کہ غنچہ و گُل
زندگی کس کو راس آئی ہے

گُل فسردہ، چمن اُداس شکیل!
یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

اشعار

منزل سے دور رہبرِ منزل تھا مطمئن
منزل قریب آئی تو گھبرا کے رہ گیا

وہی کارواں وہی راستے، وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

کہاں سے لائے وہ اِک بوالہوس مذاقِ کلیم
جسے نظر تو ملی جذبۂ دروں نہ مِلا

لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے
محبّت آئینہ ہو چکی تھی، وجودِ بزمِ جہاں سے پہلے

کتنی لطیف، کتنی حسین، کتنی مختصر
اِک نو شگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی

تابِ جلوہ مجھے نہیں، نہ سہی
لیکن اِک جُرأتِ نگاہ تو ہے

زندگی آ تجھے قاتل کے حوالے کر دوں
مجھ سے اب خونِ تمنّا نہیں دیکھا جاتا

یوں دیجئے فریبِ محبّت کہ عمر بھر
میں زندگی کو یاد کروں، زندگی مجھے

جس سے چاہا گفتگو کی، جس کو دیکھا ہنس دیئے
میرے آگے وہ کرم دُنیا پہ فرمانے لگے

بے تعلّق ترے آگے سے گزر جاتا ہے
یہ بھی اِک حُسنِ طلب ہے ترے دیوانے کا

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم، تری زندگی کنارا

یہ کالی کالی گھٹا، یہ ساون فریبِ زاہد، الٰہی توبہ
وضو میں مصروف ہے بظاہر، حقیقتاً ہاتھ مل رہا ہے

پھر نہ دینا طعنۂ ناکامیٔ ذوقِ نظر
حوصلہ ہے کچھ تو آ جاؤ نظر کے سامنے

مغرور نہ ہو فصلِ خزاں آ کے چمن میں
ایسے بھی ہیں کچھ پھول جو مرجھا نہیں سکتے

کفر و ایماں کی سیاست سے ہے ناکارہ وجود
آدمی کام کا ہوتا، اگر انساں ہوتا

اللہ رے اپنے شوق کی طوفاں پسندیاں
ساحل پہ آ کے روٹھ گئے ناخدا سے ہم

بہت دلکش ادائے رقصِ بسمل ہوتی جاتی ہے
کہیں ایسا نہ ہو ظالم ہی خود مظلوم ہو جائے

غمِ حیات سے دل کو ابھی نجات نہیں!
نگاہِ ناز سے کہہ دو کہ انتظار کرے

باقی ہے میرے دل میں ابھی عظمتِ وجود
قطرے سے کہہ رہا ہوں کہ دریا سے بچ کے چل

وہ دل حریفِ جلوۂ فردوس بن گیا
جس دل میں تیرے غم کے شرارے چلے گئے

محبّت ساتھ دیتی ہے نظر کا مگر جب تک تمنّا ہو نہ پوری

میں نظر سے پی رہا تھا تو یہ دل نے بد دُعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

عشق پروانوں کو تھا وہ جل گئے شمع کیوں خاموش ہو کر رہ گئی

سمجھے ہوئے تھے حُسنِ ازل جس کو ہم شکیلؔ!
اپنا ہی عکسِ رُخ نظر آیا قریب سے

ہر لحظہ اُنہیں ڈھونڈھتی پھرتی ہیں نگاہیں!
میں خود کو بہ اندازِ دگر ڈھونڈھ رہا ہوں

کسی کے جلوۂ رنگیں کی جاذبیت سے!
مرا وجود برنگِ بہار ہے اب تک

اُٹھا جو مینا بدست ساقی، رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی
تمام میکش پکار اُٹھے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے

وہ ہم سے خفا ہیں، ہم اُن سے خفا ہیں
مگر بات کرنے کو جی چاہتا ہے

★★★